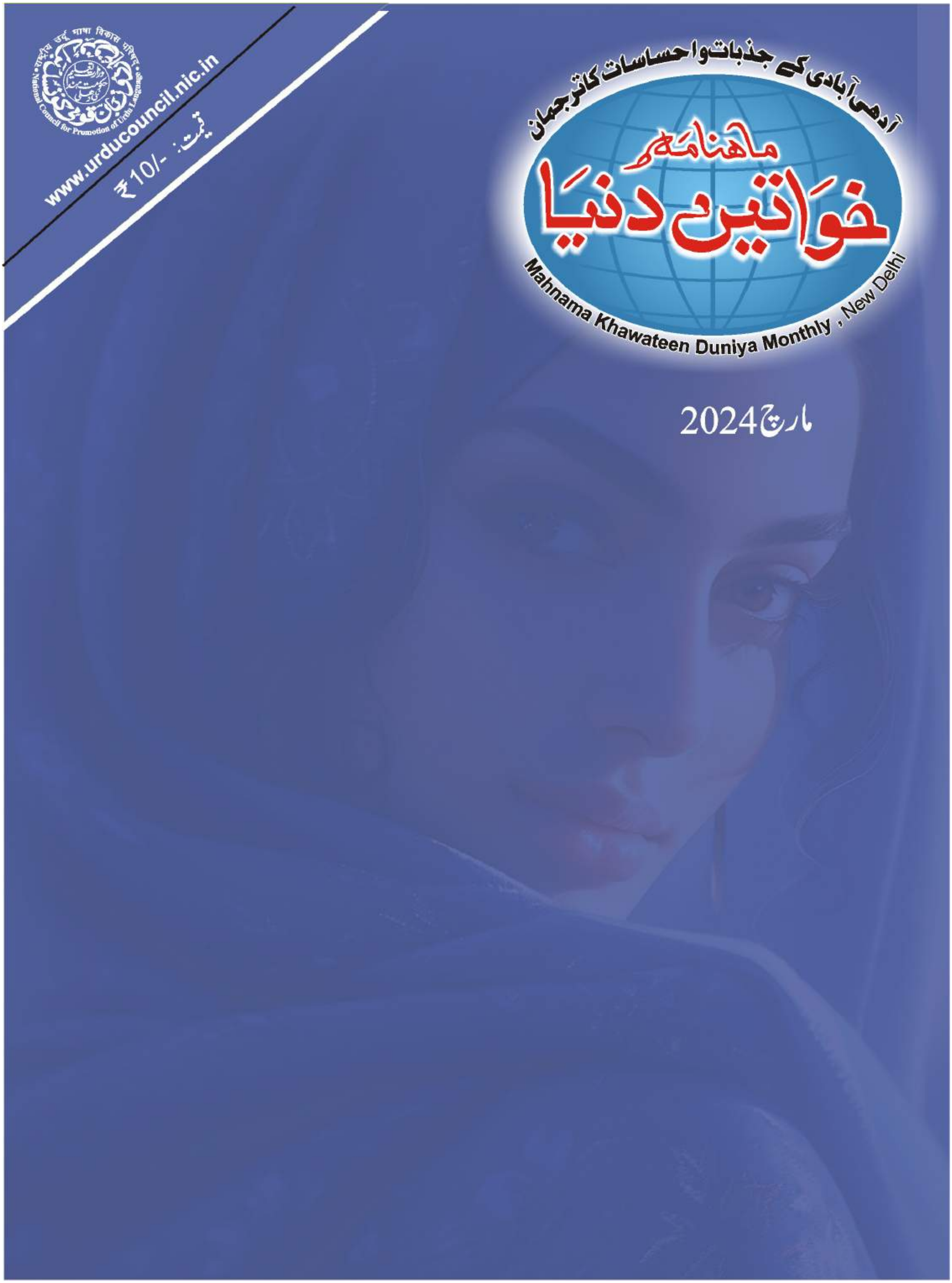

www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مارچ 2024

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:8 شمارہ:3 مارچ 2024

مدیر اعلیٰ : پروفیسر دھننجے سنگھ

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایلس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

ادارِیہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیت

ترقی پسند افسانہ نگاری کا ایک نمائندہ نام: خدیجہ مستور — ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی — 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 10

جہان نسواں

اردو ادب میں مہاتما گاندھی — پروفیسر زرینہ عبدالسلیم — 11

نسائیت کی بے توقیری کے خلاف احتجاج — ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی — 15

علی گڑھ تحریک اور تعلیم نسواں — ڈاکٹر محمد فیروز عالم — 19

ایلیز بتھ کورین مونا: ملیالی اردو شاعرہ — عارف این — 22

بیگم سلطان جہاں: ایک خاتون، ایک تحریک — محمد ارشاد — 27

بنگال کی اولین خاتون افسانہ نگار: راحت آرا بیگم — نغمہ تبسم — 32

انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا شاعر 'ساحر لدھیانوی' — زینت پروین — 37

الجبرا کا بانی الخوارزمی — فرحین انجم — 41

اردو ادب میں جموں وکشمیر کی خواتین کا حصہ — روحی جان — 44

افسانہ

الفت کے تقاضے — رینو بہل — 48

بس تم کو چاہا ہے — رومانہ عفت راہی — 52

حسن سخن

ندا احمد، نوری عشرت، افسانہ حیات — 58

صحت

انتشار شعر (بالوں کا جھڑنا) — ڈاکٹر احسان رؤف — 60

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 62

مشعل

خواتین کی ترقی اور خوشحالی کے لیے خواتین کا معاشرے میں مثبت کردار اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔عورت معاشرے کی مکمل اور اہم اکائی ہوتی ہے۔ اگرعورت مضبوط کردار کی مالک ہوتی ہے تو وہ گھر کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کو تبدیل کرسکتی ہے۔ معاشرے کی کامیابی میں تعلیم یافتہ خواتین کا کردار ناگزیر ہے۔اس کو ہم کسی بھی طور پر نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت معاشرے کی تعمیر میں اپنا اہم رول ادا کرتی ہے۔تعلیم سے آشنائی ہر ایک فرد کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ تعلیم کے ذریعے ہی انسان صحیح اور غلط میں تمیز کرسکتا ہے۔لڑکیاں تعلیم یافتہ رہیں گی تو وہ آنے والی نسلوں کا مستقبل بھی سنوار سکتی ہیں۔

خواتین کے لیے معاشرے میں یکساں قوانین بنائیں جائیں تو وہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتی ہیں۔خواتین کے بارے میں منفی سوچ اور رویوں کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔خواتین کو معاشی طور پر بااختیار بنائے جانے پر بھی زور دینا چاہیے۔ان کے اندر عزم اور حوصلہ پیدا کرنا چاہیے تاکہ وہ بدلتے حالات کا مقابلہ باآسانی کرسکیں۔خواتین کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگی تو وہ بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ باآسانی کرسکتی ہیں۔

خواتین کی فنی مہارتوں کو پوری طرح سے معاشرے کے سامنے نہیں لایا گیا ہے۔خواتین کا وومن امپاورمنٹ کے پیچھے مقصد یہی ہے کہ خواتین کو مساویانہ حقوق حاصل ہوں۔ان کو برابر کے مواقع مہیا کیے جائیں تاکہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہوسکے۔

حالیہ دور میں خواتین میں اپنے حقوق کے تئیں بیداری پیدا ہوئی ہے۔ ہر دور میں خواتین نے ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اپنے عزم سے خواتین بڑے سے بڑے فیصلے بھی آسانی سے کرسکتی ہیں اور ان پر عمل پیرا ہو کر معاشرے میں انقلاب لاسکتی ہیں۔خواتین کی خودمختاری کا صحیح معنوں میں ادراک بہت ضروری ہے۔ان کے ساتھ ہر معاملے میں انصاف اور برابری کا معاملہ کیا جائے تو اس کے اور بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

خواتین کو ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ان کو بااختیار بنانے کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ معاشی طور پر خود کفیل ہوں اور ان کو برابری کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو سکے جو ان کے مزاج اور مستقبل کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

آپ کا

پروفیسر دھننجے سنگھ

شخصیت

ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی

ترقی پسند افسانہ نگاری کا ایک نمائندہ نام
خدیجہ مستور

خدیجہ مستور (1927-1982) اردو کی ان اہم اور باکمال خواتین فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات اور فکری وفنی امتیازات کی بدولت نہ صرف اردو فکشن کی تاریخ میں کامیاب رہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ آزادی کے بعد جن خواتین تخلیق کاروں نے اپنے منفرد بیانیے اور کارناموں کی بدولت اپنے نام روشن کیے ان میں ایک بڑا نام خدیجہ مستور کا بھی ہے۔ خدیجہ مستور نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ترقی پسند تحریک کے بینر تلے کیا اور تاعمر اسی کے زیر اثر لکھتی رہیں۔ یوں تو ادبی دنیا میں ان کی شناخت ان کے ناول ''آنگن'' کی بدولت حد درجہ توانا اور مضبوط ہے مگر بغور دیکھا جائے تو ان کی بنیادی شناخت ایک افسانہ نگار کی ہی ہے۔ جہاں دو ناول 'آنگن (1962)' اور 'زمین' (1983) ان کی یادگار ہیں وہیں ان کے پانچ افسانوی مجموعے کھیل (1944)، بوچھار (1946)، چند روز اور (1951)، تھکے ہارے (1962) اور ٹھنڈا میٹھا پانی (1981) ان کے تخلیقی سرمایے میں شامل ہیں۔ ان افسانوی مجموعوں میں خدیجہ مستور کی بہت سی ایسی کہانیاں شامل ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو افسانہ نگاری کی تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی ہے۔

خدیجہ مستور چونکہ بچپن سے ہی حد درجہ ذہین اور حساس طبیعت کی تھیں اس لیے انھوں نے بہت جلد نہ صرف پڑھنا لکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ زندگی کی ان چھپی ہوئی حقیقتوں کو سمجھنے لگیں تھی جو اس عمر میں عام بچوں کی پہنچ سے باہر ہوتی ہیں۔ خدیجہ مستور نے بھی دیگر تخلیق کاروں کی طرح شعر وشاعری سے ہی اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا لیکن بہت جلد ان کا بھی رجحان کہانیوں کی طرف ہو گیا اور پھر باقاعدہ طور پر افسانے لکھنے لگیں۔ بقول تاج بیگم فرخی:

> ''خدیجہ کی نظر بہت تیز اور مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ بچپن ہی سے زندگی کی اُن چھپی ہوئی حقیقتوں کو سمجھنے لگی تھیں جو عام بچوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ وہ اپنی معلم بھی آپ ہی تھیں تعلیم میں کوئی تسلسل نہیں تھا۔ جو جی چاہا پڑھ لیا، جب جی چاہا پڑھ لیا لیکن وقت، زمانہ، ماحول اور فضا ذہین بچوں

کے اِدراک میں تیزی اور براقی پیدا کرتی ہے۔روشن ذہن کے سامنے فطرت اپنے در کھول دیتی ہے اور زندگی خود اپنی وضاحت کرتی ہے۔فطرت اور زندگی نے خدیجہ کے سامنے اپنے در کھول دیے۔آؤ ہمیں دیکھو۔ہم سے تمہیں بہت کچھ حاصل ہوگا۔تمہاری فکر کا اُفق وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔خدیجہ نے اس پیش کش کو بڑے شوق اور ذمہ داری سے قبول کیا۔لکھنے لکھانے کی طرف پوری طرح توجہ کی۔شاعری کی انگلی پکڑ کر چلنے کی کوشش لیکن شاعری نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔شاعری ہر کس و ناکس کو منہ نہیں لگاتی۔خدیجہ نے جلد ہی شاعری سے ناتا توڑ لیا۔افسانے کی دنیا نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا۔''

(خدیجہ مستور: شخصیت اور فن، تاج بیگم فرخی، اکادمی ادبیات پاکستان 2010، ص18)

اس طرح خدیجہ مستور نے شاعری کو چھوڑ کر افسانہ نگاری کو اپنی تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔انھوں نے سب سے پہلے کون سی کہانی لکھی تھی اور کس رسالے میں چھپی تھی یہ مسئلہ تا ہنوز زیرِ تحقیق ہے۔کہانی ''جوانی'' کو خدیجہ مستور کا پہلا افسانہ قرار دینا یا پھر یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز قرار دینا میرے خیال سے قطعاً درست بات نہیں ہے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ ان کی پہلی کہانی 'جوانی' کے عنوان سے 1944 میں رسالہ 'ساقی' میں شائع ہوئی تھی اور پھر اسی سال ان کا پہلا شعری مجموعہ ''کھیل'' بھی سامنے آیا جس میں کل گیارہ کہانیاں شامل تھیں۔کسی بھی تخلیق کار یا افسانہ نگار کے لیے یہ غیر ممکن بات ہے کہ وہ جس سال اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کرے اسی سال اس کا مجموعہ بھی آجائے۔اس کے علاوہ ایک دوسرے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ خدیجہ مستور کا افسانہ 'جوانی' سے قبل ان کی کہانیاں عالمگیر، خیام، ادب لطیف اور دیگر رسائل میں بھی شائع ہوتی تھیں۔خود خدیجہ مستور اپنی آپ بیتی میں رقمطراز ہیں:

'1942 میں لکھنا شروع کیا اور ایک رسالے کو (جس کا نام اب یاد نہیں) اپنی کہانی چھپنے کے لیے بھیج دی۔کہانی تو خیر نہ چھپی مگر میرے نام رسالہ آگیا۔اس قدر خوشی ہوئی کہ نہ تو کھیلنا یاد رہا نہ کھانا۔رسالے پر سے چٹ اتار کر بڑی احتیاط سے بکس میں رکھ دی پھر بہت سوچ سمجھ کر ایک مضمون لکھا اور وہ ایک زنانے پرچے میں چھپ گیا۔یہ مضمون پردے کی حمایت میں تھا۔۔۔ابتدائی کہانیاں '' خیال'' اور ''عالمگیر'' میں چھپتی رہیں 1945 میں ذرا سنبھل کر لکھنا شروع کیا۔''

(آپ بیتی، خدیجہ مستور، 'فنون' خدیجہ مستور نمبر، لاہور 1984، ص270)

بہر حال یہی وہ دور تھا جس میں خدیجہ مستور نے اپنی کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا۔یقیناً یہ عہد ترقی پسند تحریک کا دورِ عروج تھا۔1932 میں ''انگارے'' کی اشاعت اور پھر 1936 میں ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کی بدولت نہ صرف اردو کی ادبی فضا بدل چکی تھی بلکہ یہ تو اس تحریک کا دورِ عروج تھا اور نئے ادب نے بھی اپنے قدم جما لیے تھے۔ادب زندگی کے نئے نئے تقاضوں کا ترجمان بن کر افکار و آگہی کی نئی نئی راہیں ہموار کر رہا تھا۔شاعری کی طرح کہانیوں میں بھی قدیم و فرسودہ روایات کی جگہ نئی حقیقت نگاری اور بے باکانہ بیانیے نے جگہ لے لی تھی۔اب کہانی محض کہانی اور سامانِ تسکین نہ رہ کر حقیقی زندگی کا ترجمان بن چکی تھی۔خدیجہ مستور نے ایسے ہی حالات میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔چونکہ یہ ترقی پسند تحریک کا دورِ عروج تھا اور خود خدیجہ مستور کو اس عہد کے ممتاز شاعر و افسانہ اور ترقی پسند تحریک کے حامی احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی حاصل تھی اس لیے وہ نہ صرف ان کی رہنمائی میں افسانے لکھتی رہیں بلکہ تحریک سے بھی وابستہ ہوگئیں اور اس کی حد درجہ سرگرم و فعال رکن بھی بن گئیں نیز آگے چل کر جہاں وہ اس کی سکریٹری بھی بنیں وہیں ان کی بدولت انجمن میں بہت سی روایتی اور غیر روایتی امور کی

داغ بیل بھی پڑی۔ فارغ بخاری لکھتے ہیں:

”خدیجہ انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور کی سکریٹری بننے کے بعد انجمن کے جلسوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لینے لگی۔ جب کبھی لاہور جاتا۔ لاہور کی ہفت روزہ تنقیدی میٹنگ میں اُس سے ضرور ملاقات ہوتی۔ اس کی تنقید نپی تلی اور تعمیری ہوتی لیکن تنقید کے دوران ہمیشہ مجھ سے ضرور اُلجھ پڑتی جیسے وہ میری ہر بات کی تردید کا تہیہ کیے ہوئے ہو۔ میں معمہ حل نہ کرسکا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ سوائے اس کے کہ پہلی میٹنگ میں گیت پر بحث کے دوران جو جھڑپ ہوئی تھی اُسی خلش کو وہ اب تک ذہن سے نہیں نکال پائی تھی۔ تاہم میٹنگ تک ہی یہ بحث برائے بحث کی تلخی محدود رہتی۔ اس کے بعد یوں لگتا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں وہ اپنی شوخ وشنگ باتوں اور طنز ومزاح سے محفل پر چھا جاتی۔ مقررہ وقت پر میٹنگ شروع کرنے کی روایت اسی نے قائم کی تھی۔ خواہ حاضرین کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو جلسے کی کاروائی وقت پر شروع کردی جاتی۔ یہاں تک کہ یہی روایت ایک ضابطہ بن کر ایسی رائج ہوئی کہ پورے پاکستان میں انجمن کی پہچان بن گئی۔“

(ضدی، فارغ بخاری، فنون، لاہور 1984 بحوالہ خدیجہ مستور: شخصیت اور فن، تاج بیگم فرخی، اکادمی ادبیات پاکستان، ص 29-28)

ترقی پسند تحریک سے خدیجہ مستور کی وابستگی عملی اور فکری دونوں ہی سطحوں پر کچھ اسی نوع کی تھی۔ انھوں نے اس کے زیر سایہ نہ صرف اپنے افسانے اور ناول تخلیق کیے بلکہ ان کی تخلیقات میں ترقی پسند تحریک کے موضوعات ومسائل کی بھرپور عکاسی دیکھی جاسکتی ہے۔ خدیجہ مستور ایک مشرقی روایات کی حد درجہ پاسدار خاتون تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ساتھ برقع کی پابند تھیں۔ گرچہ ”انگارے“ کی اشاعت سے وہ غیر معمولی طور پر متاثر تھیں اور عصمت چغتائی اور رشید جہاں کے افسانوں نے ان کی افسانہ نگاری میں بھی روشن خیالی وتازگی، بے خوفی وبے باکی اور بغاوت واحتجاج کا رنگ پیدا کیا تھا مگر باوجود اس کے ان کے افسانوں میں ایک اعتدال اور توازن نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

”خدیجہ مستور کے وہ افسانے جو انھوں نے آزادی اور قیام پاکستان سے قبل لکھے، لب ولہجہ اور اسلوب کے اعتبار سے عصمت چغتائی سے بہت قریب ہیں بلکہ شدید طور پر متاثر نظر آتی ہیں۔ لیکن اگر اسلوب سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو ان کے اور عصمت کے موضوع، مسائل اور ان کے برتاؤ میں نمایاں فرق موجود ہے۔“

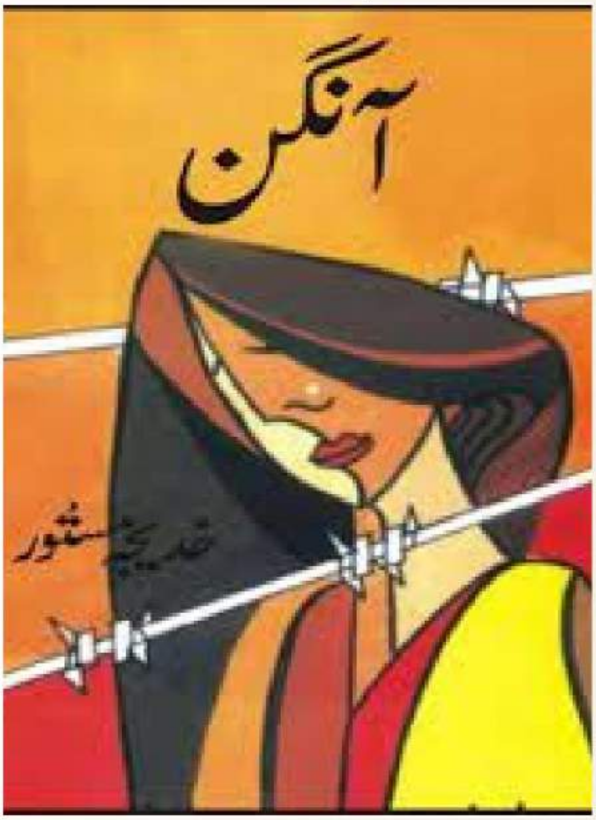

(آنگن اور اس کی مصنفہ، الطاف فاطمہ، ماہِ نو، مئی 1983)

اس طرح خدیجہ مستور کے افسانوں میں روشن خیالی اور ایک انقلابی تبدیلی کے باوجود ان کے یہاں رشید جہاں اور عصمت چغتائی کی اتباع وپیروی نہیں کے برابر ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عصمت چغتائی کا وہ اسلوب جس کے بارے میں وقار عظیم کہتے ہیں کہ 'تیکھے طنز، چست فقرے، شکر میں لپٹی ہوئی کڑوی باتیں، ہنسی مذاق اور اسی ہنسی مذاق میں ہجو پھبتیاں، باتوں کی چٹکیاں، ہنس ہنس کر سب کچھ کہہ جانا، یہ سب سیدھی سادی روز مرہ کی باتیں ان کے فن کے تھوڑے سے حربے ہیں' کے برخلاف مشرقی روایات سے گہری واقفیت ووابستگی کا احساس ہوتا ہے۔ حد درجہ آسان، عام فہم اور شگفتہ وشائستہ اسلوب میں اپنی بات پیش کرنے کا ہنر خدیجہ مستور کے اسلوب کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پڑھتے وقت ہمیں سنجیدگی ومتانت، سبک روی وپختگی کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر ان میں طنز ومزاح کے ہلکے ہلکے پھوہار کا بھی احساس ہوتا ہے۔ خدیجہ مستور کا تعلق چونکہ ایک متوسط گھرانے سے تھا اس لیے

موضوعات کی سطح پر ان کے افسانوں میں اسی سماج ومعاشرے کی عکاسی نظر آتی ہے۔خدیجہ مستور کے پہلے افسانوی مجموعہ ''کھیل'' کی بیشتر کہانیاں اس کی عمدہ مثالیں کہی جاسکتی ہیں۔افسانہ 'کھیل' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے شکیل اور ہاشمہ کی جھوٹی محبت کی داستان بیان کی ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''آؤ آج پھر وہی محبت کا کھیل کھیلیں، جو تم اب سے دو سال قبل کھیلا کرتے تھے۔''اس نے شکیل کا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھ سے تھام لیا۔''تم یہ کیا کہہ رہی ہو ہاشمہ؟'' وہ حیرت سے دیکھنے لگا۔آنکھوں کے سامنے ایک پردہ سا اُٹھتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

''ہاں شکیل! وہی کھیل، کیا تم اتنی جلدی بھول گئے۔میرے شریر کھلاڑی، ایک بار اپنی آنکھیں شرارت سے نچا کر پھر کہو، ہاشمہ جان۔''اس کی مردہ سی آنکھوں میں پاگل پن ٹپکنے لگا۔ شکیل گم سم اسے دیکھ رہا تھا۔''

(کھیل، خدیجہ مستور، مشمولہ مجموعہ 'کھیل'، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1944، ص18)

اس کہانی میں خدیجہ مستور نے ایک ایسی جھوٹی اور ناکام محبت کا نقشہ کھینچا ہے جس کا شکار کہانی کا کردار ہاشمہ ہی نہیں بلکہ اس جیسے سماج کے بہت سے لوگ بھی ہوتے ہیں اور پھر اسی کی فکر میں ہاشمہ ہی کی طرح مرض کا شکار ہو کر ناآسودہ حالت ہی میں اس دنیا سے بھی چلی جاتی ہے۔ افسانوی مجموعہ ''کھیل'' میں افسانہ 'کھیل' ہی نہیں بلکہ اس مجموعے میں شامل بیشتر کہانیوں میں خدیجہ مستور نے ایسے رومان کو موضوع بنایا ہے جن کی زندگیاں درحقیقت اس سے خالی نظر آتی ہیں۔ان کہانیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے محبت کے ناآسودہ جذبے کا بہت ہی فنکارانہ انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے اس سماج کے متوسط طبقے کا سہارا لیا ہے جس سے خود ان کا تعلق تھا۔عصمت چغتائی کی طرح خدیجہ مستور کی کہانیوں میں بھی اس سماج و معاشرے کا بڑا گہرا مشاہدہ اور احساس کی شدت نظر آتی ہے جس میں وہ سانس لیتی ہیں۔بہت سی سامنے کی باتوں کو بھی خدیجہ مستور نے نہ صرف اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے بلکہ فنکارانہ اوصاف سے ان میں ایک انفرادیت اور روح بھی پھونک دی ہے۔کہانی ''موہنی'' کے مندرجہ ذیل اقتباسات دیکھیں:

''بابو جی! یہ لو موہنی، جسے چاہتے ہو اسی کے سامنے گھس کر ماتھے پر لگاؤ۔اگر آسا پوری نہ ہو جائے تو دام واپس لے لینا، یوں سمجھو بابو جی کہ خود تمہارے کدموں میں نہ گرتے تو جب کہ بات''

(موہنی، خدیجہ مستور، مشمولہ مجموعہ 'کھیل'، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1944، ص22)

اس کہانی کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بظاہر ایک غریب اور معمولی لڑکی کے گزارے کے لیے اس جدو جہد کو پیش کرتی ہے جس کا سامنا اسے زندگی بھر رہتا ہے لیکن اگر ہم اس کی باریکی پر نظر ڈالیں تو یہ افسانہ انسان شناسی اور مشاہدے کی باریک بینی کی ایک عمدہ مثال ہے۔اس کے علاوہ اس کہانی کے مطالعے سے اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کسی ایسے تخلیق کار کی پیش کش ہے جس نے ابھی لکھنے کی ابتدا ہی کی ہو بلکہ اس کے برخلاف باریک بینی، گہرے مشاہدے اور تجربات کی بھٹی میں نکل آنے والے وہ تمام اوصاف دیکھے جاسکتے ہیں جو ایک بڑے تخلیق کار کے امتیازات کہے جاسکتے ہیں۔اس افسانے میں تجربات و مشاہدات کے تجزیے کے ساتھ ساتھ جنسی گھٹن اور منافقانہ رویوں کا وہی انداز دیکھنے کو ملتا ہے جو اس عہد کے دیگر افسانہ نگار مثلاً منٹو، عصمت، کرشن چندر، احمد علی اور احمد ندیم کی کہانیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔کہانی موہنی کا اختتامیہ ملاحظہ ہو:

''شام کو وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر دیر تک اپنے بال سنوارتا رہا اور پھر بیٹھک کا دروازہ کھول کر سامنے کی کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔کچھ کالی کلوٹی لڑکیاں سوکھے اُپلے ٹوکرے میں بھر رہی تھیں اور اُس کی ماں بھینسوں کو سانی لگا رہی تھی۔وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔تھوڑی دیر میں وہ اپنے مکان سے نکلی اور بالکل لڑکھڑاتی ہوئی نکل کی طرف بڑھی۔ اُس کے سرخ سرخ پپوٹے پھولے ہوئے تھے۔ان میں سے جھانکتی ہوئی مخمور آنکھیں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔معلوم ہوتا تھا وہ ابھی سو کر اُٹھی ہے۔اس نے جیب سے موہنی نکال کر مٹھی میں داب لی تاکہ وقت پر چوک نہ جائے۔وہ اپنا لہنگا اونچا کر کے منہ دھونے لگی اور جب منہ دھو کر وہ اپنی لال چندری سے منہ پوچھنے لگی تو اچانک اس کی گھورتی ہوئی ہولناک آنکھوں سے اس کی نگاہوں کا تصادم ہو گیا۔اس نے جلدی سے موہنی ماتھے پر رگڑ لی اور محبت کے جذبات آنکھوں میں پیدا کر کے مسکرانے لگا لیکن اُس کی آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں۔پھر سرارت کی۔کیا میرے آدمی کے لٹھ کو بھول گئے۔ دیکھو اب ہمیں نہ چھیڑنا۔وہ اپنی پتلی سی کمر لچکاتی چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ گلی میں اس کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کالی میلی کچیلی لڑکی کمر پر اُپلوں کا ٹوکرا رکھے

اپنے ایک ہاتھ سے اپنے الجھے ہوئے گرد آلود بالوں میں کھبر کھبر کھجلا کر اُسے نہ جانے کب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ موہنی پھینک کر اُس کی تاثیر سے بے ساختہ ہنس پڑا۔لڑکی گھبرا کر قدم اُٹھانے لگی۔گلی کے موڑ سے موہنی فروش ایک بوڑھے کے ساتھ چھما چھم کرتی چلی آرہی تھی۔ ''بابا آجما کے دیکھو۔ یہ دبائی اگر ایک مرتبے میں جوان نہ ہو جاؤ تب کی بات ہے۔وہ بیٹھک کا دروازہ بند کر کے دوسری گلی میں ہوگیا۔''

(ایضاً،ص26)

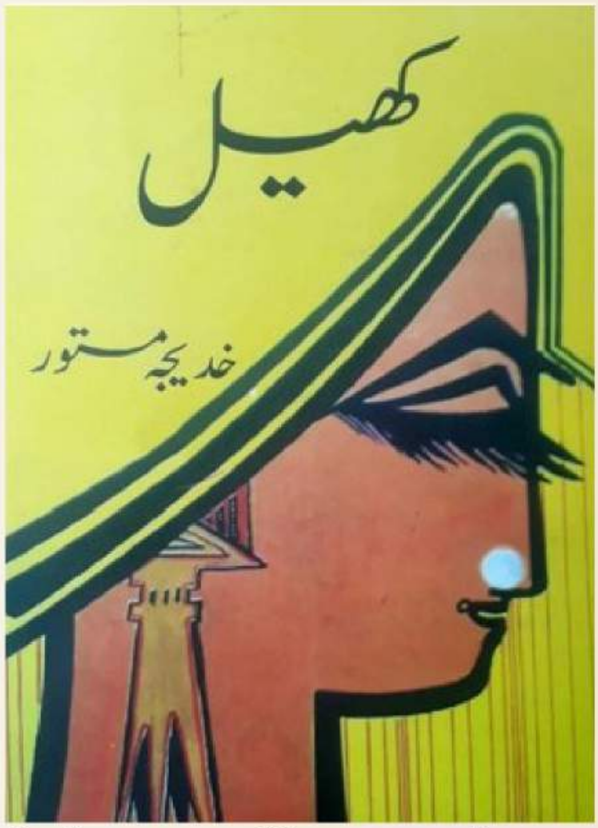

اس اقتباس سے خدیجہ مستور کے گہرے مشاہدے اور باریک بینی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان و بیان اور اسلوب و اظہار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے منفرد، حد درجہ رواں دواں اور منفرد و پرقوت بیانیہ کے ذریعے کہانی میں جان ڈال دی ہے۔اسی طرح ان کی دیگر کہانیاں مثلاً اب تم جا سکتے ہو، دھکا، نہ جاؤ، معصوم، باندی کی عید، بوچھار، ہنھ، عشق، جوانی، چپکے چپکے، یہ دیوانی، ہوس، تین عورتیں وغیرہ ان کے مشاہدات و تجربات کی عمدہ عکاسی کے ساتھ اس عہد کی اخلاقی پستی، ذہنی انحطاط، جنسی اُبال، خواتین کے ساتھ بدسلوکی اور لڑکیوں کو چھیڑ چھاڑ کے واقعات پیش کرتی ہیں۔ان کے بعض افسانوں میں شہر کی گھٹن بھری زندگی، اخلاقی زوال، طبقاتی کشمکش اور مفلوک الحالی، آزادی کے بعد رونما ہونے والے ہولناک فسادات کا بیان بڑی خوبصورتی اور فنکاری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے چند روز اور، چلی پی سے ملن، نیا سفر، محاذ سے دور اور ٹامل ٹوئیے بطور خاص پیش کیے جاسکتے ہیں۔اسی طرح ان کے بعض افسانے خالص نفسیاتی قسم کے ہیں جن میں ہم خدیجہ مستور کی فنکارانہ صلاحیتوں اور کمالات کو دیکھ سکتے ہیں۔افسانہ محاذ سے دور میں نہ صرف جنگ کی تباہ کاریوں اور انسان کی اخلاقی زوال اور بربادیوں کا بیان ہے بلکہ اس میں گہرے مشاہدے، نفسیاتی مطالعے، گرد و نواح کے ماحول کی عکاسی اور ان سب سے بڑھ کر قوت بیانیہ کا بڑا مؤثر اور عمدہ نمونہ ہے۔ خدیجہ مستور کے ان افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کی پیش کش پر بڑی مضبوط گرفت ہے۔ خدیجہ مستور کی زبان و بیان اور اسلوب و اظہار افسانے کے لحاظ سے بھی بڑی اہم اور موزوں ہے۔انھوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ موضوعاتی سطح پر بھی اردو افسانے کو نئی وسعتوں اور امکانات سے روشناس کرایا۔

اس طرح خدیجہ مستور آزادی کے بعد اور بالخصوص بیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنی فکشن نگاری کی بدولت اپنی ایک منفرد شناخت بنانے والی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔انھوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود بھی افسانہ نگاری میں نہ صرف اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ اردو افسانے کے سرمایے میں بھی قابل قدر اضافے کیے۔ان کے افسانے زبان و بیان اور اسلوب و اظہار کے ساتھ ساتھ موضوعات کی سطح پر بھی بڑے متنوع اور منفرد معلوم ہوتے ہیں اور اس کی بدولت اردو افسانہ نئے امکانات اور وسعتوں سے بھی ہمکنار ہوا۔خدیجہ مستور کی انھیں خدمات کی بدولت ان کا نام اردو فکشن نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا اور جب بھی ترقی پسند افسانہ نگاری کا ذکر ہوگا تو اس کے لکھنے والوں میں ایک بڑا اور اہم نام خدیجہ مستور کا بھی آئے گا۔

□□□

Dr. Abdur Razzaque Ziyadi
House No.372/14 (Fourth Floor)
Ghaffar Manzil
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
Mob: 9911589715

شاعرات کے منتخب اشعار

آستاں پر ترے پیشانی کو گھستے گھستے
سر ہی غائب ہوا جس میں کہ تیرا سودا تھا

اک آہ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا
لو آج ہم نے اس کا ب y] جھگڑا مٹا دیا

نواب اختر

باغ عالم میں چھڑانا تھا اگر اپنوں سے
پہلے ہی سبزۂ بیگانہ بنایا ہوتا

گرچہ منظور نہ تھی خانہ نشینی میری
تو مجھے ساکن ویرانہ بنایا ہوتا

امراؤ

جدھر کے دیکھنے سے جان زار جاتی ہے
اسی طرح کو نظر بار بار جاتی ہے

یہ بغض تھا کہ نہ چھوڑا تمھارے کوچے میں
صبا لیے مرا مشت غبار جاتی ہے

امیر

تو نے تو رہا کر ہی دیا زلف دوتا ہے
ہم جان سے بھی جائیں تو اب تیری بلا سے

ملتا ہے وہ مضمون ہمیں ذہن رسا سے
رہ جاتا ہے جو بندش فکر شعرا سے

اہل

بسم اللہ جان عشق میں قربان کیجیے
مانند زلف دل نہ پریشان کیجیے

نہ کیجیے ناز حسن عارضی پر
نہ سمجھو یہ بہار بے خزاں ہے

بسم اللہ

موت آتی ہے نہ ہے زیست کا یارا مجھ کو
ہائے آشفتہ ترے مرنے نے مارا مجھ کو

موت پر بس نہیں چلتا ہے کروں کیا ورنہ
تو نہیں ہے تو نہیں زیست گوارا مجھ کو

بنو

بہار آئی ہے پھر رنگ دل ناکام بدلا ہے
ہوا بدلی ، مزاج بادۂ گلفام بدلا ہے

تجھے معلوم کیا ہے ناصحا ہم کو محبت میں
مزا ہے کچھ تو جو تکلیف سے آرام بدلا ہے

بدلا

شب بزم ملاقات میں ہر چند یہ چاہا
آنکھیں میں لڑاؤں کہیں اس رشک قمر سے

پر خوف مرے جی میں یہی آیا کہ ہے ہے
نازک ہے نہ دب جائے کہیں بار نظر سے

بہو

(تذکرۂ قدیم شاعرات اردو، مرتب: ڈاکٹر اکبر حیدری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی
آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر 1996)

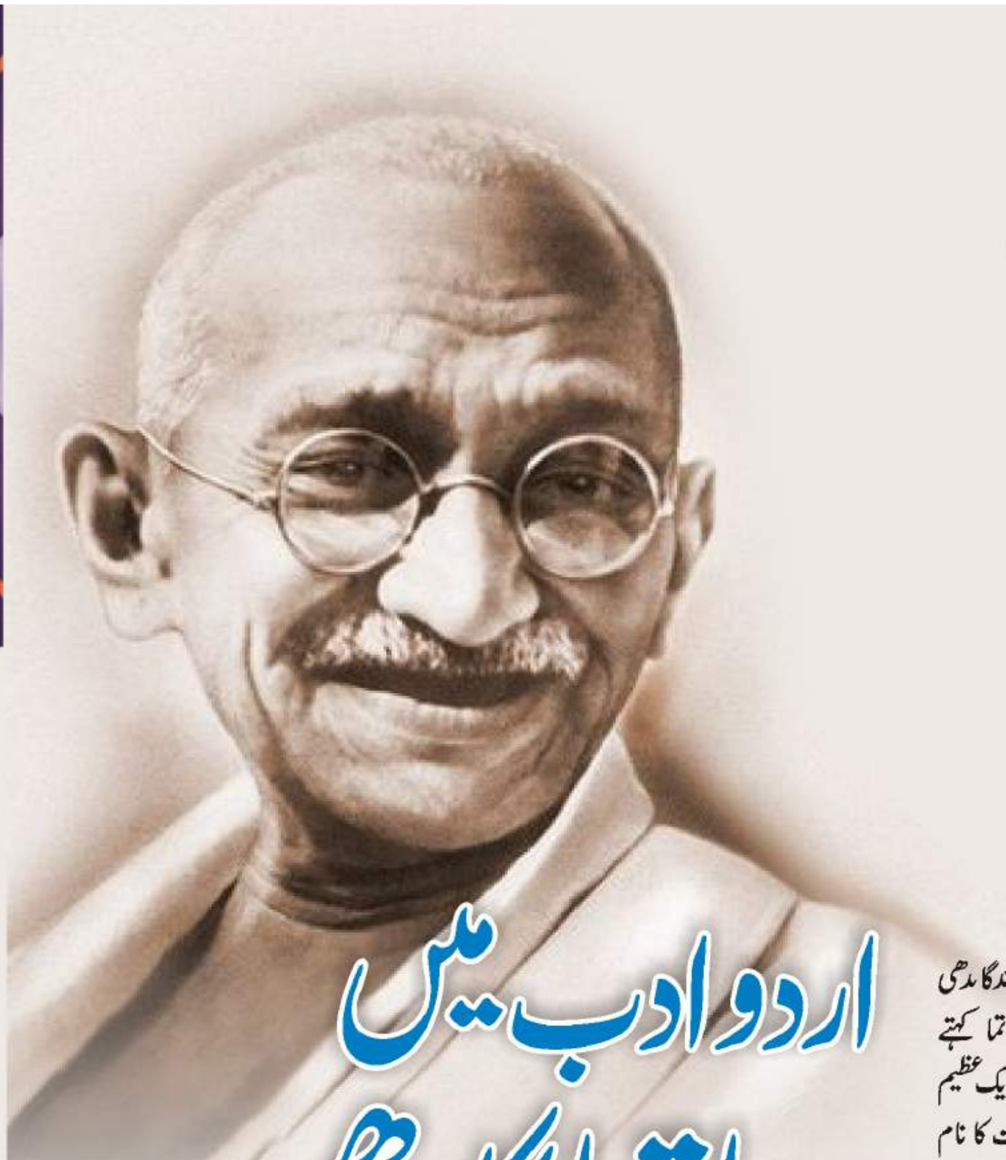

پروفیسر زرینہ عبدالسلیم

اردو ادب میں مہاتما گاندھی

موہن داس کرم چند گاندھی جنھیں ہم احترام سے مہاتما کہتے ہیں اور محبت سے باپو جی ایک عظیم شخصیت ، ایک فلسفہ حیات کا نام ہے۔جنھیں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی صدیوں در صدیوں یاد رکھا جائے گا۔ معاصر تاریخ کی یہ عظیم الشان شخصیت،قومی تحریک کے سب سے بڑے سربراہ اپنی مثال آپ تھے۔انھوں نے ذات ، زبان،فرقہ اور مذہب سے بلند ہوکر انسانوں کی خدمت کی ۔ان کی زندگی انسان کے بنیادی حقوق کی حصولیابی کے لیے صرف ہوگئی۔یہ وہی ہندوستانی تھے جن کے گرد ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی سب یکجا ہو گئے اور ہندوستان کو غلامی سے آزادی دلائی۔ آزادی کی جدو جہد میں ان کے ہتھیار تھے اہنسا، عدم تشدد، محبت۔

مہاتما گاندھی صرف ہندوستان کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے امن وامان کا پیغام لے کر آئے اور اس وقت جب دنیا میں نفرتیں، جنگ وعدل، ناانصافیاں، ظلم اور غلامی تھی اس وقت امید کی شمع لے کر رونما ہوئے اور پوری دنیا کو اپنے پاکیزہ خیالات سے روشن کر دیا۔ اتنی عظیم شخصیت کا ذکر کسی ادب سے کیسے دور رہ سکتا تھا؟ جس طرح دنیا کی دیگر زبانوں میں گاندھی جی کا بھرپور ذکر ہے اسی طرح اردو ادب نے بھی گاندھی جی کے خیالات ان کی شخصیت سے خوب فیض اٹھایا ان کی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا حصہ لیا اور ان کی تعریف اور توصیف سے بھی پیچھے نہ ہٹے۔ان کے لیے کئی ادیبوں نے عزت اور احترام کی آواز بلند کی۔

اردو نثر میں مہاتما گاندھی: اردو ادیبوں نے گاندھی جی کے حالاتِ زندگی کو اکثر موضوع بنایا اور ان کی شخصیت سے متاثر کیا اور ان کی زندگی کے ان پہلوؤں کی معلومات بھی دی جن سے ہم انجان تھے۔ یو آر۔ ٹراؤ نے اپنی کتاب" ایسے تھے گاندھی جی" میں گاندھی جی کی مکمل شخصیت بیان کی ۔ان کی اپنے ماں باپ سے عقیدت، انسانیت کا درس،

سچائی کا راستہ اختیار کرنے کی نصیحت، وکالت، کام کرنے کے اصول، بچوں کے ساتھ ان کا حسنِ سلوک، غریبوں سے محبت جیسی ہر خوبی کو بیان کیا۔قدسیہ زیدی نے اپنی کتاب" گاندھی بابا کی کہانی" میں گاندھی جی کی شخصیت اور ان کی زندگی کی کہانی کو ایک ماں کی زبانی بڑی خوبصورتی اور معصومیت کے ساتھ پیش کیا جس میں ایک ماں اپنے بیٹے ہری کو ان کے مطابق بتاتی ہے تا کہ بچے کے دل میں گاندھی جی کے لیے عقیدت اور محبت پیدا ہو۔" گاندھی جی اور ان کے خیالات" اس کتاب میں عبداللطیف اعظمی نے ان تمام مضامین کو شامل کیا جس میں اردو ادیبوں نے گاندھی جی کی سادگی، عظمت، انسانیت، اتحاد اور ان کی زندگی کے اہم واقعات کو بیان کیا۔" گاندھی جی دکھنی افریقہ میں" اس کتاب میں یوسف ناظم نے اس بڑی شخصیت کی چھوٹی سی کہانی پیش کی جس میں ان کے افریقہ کے سفر کا ایک قصہ پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر مکٹ بہاری لال نے گاندھی جی کے پیغام، خدا کی عبادت، مذہبی اتحاد، حق پسندی، اصلاح، عدم تشدد، انسانی ترقی، قومی اتحاد اور محبت کے پیغام کو بیان کیا۔شکیل اختر فاروقی نے انو بندھو پادھیائے کی کتاب" گاندھی جی کے مختلف روپ" کا ترجمہ کیا تو روشن لال نے ان کے تاریخی خطوط کو اکٹھا کیا۔گاندھی عصر کی نیشنل کمیٹی برائے قومی یکجہتی نے" گاندھی کا ہندوستان، کثرت میں وحدت" کو مرتب کیا جس میں ان کے بنیادی خیالات کو مضمون کی شکل میں پیش کیا گیا۔اس کے علاوہ لالہ متصدی لعل ہندی نے" کارنامہ مہاتما گاندھی" لکھا۔" اندھی جی اور ڈاکٹر سید عابد حسین" پروفیسر اصغر مہدی نے مرتب کی اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین کے وہ مضامین شامل ہیں جو انھوں نے گاندھی جی کے لیے لکھے۔" گاندھی جی اور مسلمان" میں ڈاکٹر رضی احمد نے مہاتما گاندھی اور مسلمانوں کے پر خلوص تعلق پر روشنی ڈالی۔ضیاء عظیم آبادی نے" مہاتما گاندھی" نامی کتاب میں ان کی سچائی، فرض شناسی، انسان دوستی، محبت، سیاست، عدم تشدد کو پیش کیا اور ان کے اقوالِ زریں سے آشنا کرایا۔" رہبرِ ایشیا" جسے ساجد صدیقی اور دالی آسی نے مرتب کیا، اس کے علاوہ " مہاتما گاندھی کی کہانی" اپنی طرز کی ایک علحدہ کتاب ہے جس میں ایس ڈی ساونت اور ایس ڈی باڈلکر نے تصویروں کے ذریعے گاندھی جی کے واقعات کو پیش کیا اس کتاب کا پیش لفظ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا تھا۔ان تمام کے علاوہ بھی اردو کے بے شمار مضمون اور مقالوں میں گاندھی جی کی رہنمائی اور ان کی شخصیت کے اثرات اردو ادب پر نظر آئے۔ پریم چند بھی گاندھی جی سے بے حد متاثر تھے ان کی ناولوں" چوگانِ ہستی، "میدانِ عمل" " پردۂ حجاز اور" منگل سوتر" میں گاندھی جی کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔اردو ڈراموں میں رونق دکنی کا ڈرامہ" رکت دان" اظہر افسر کی" شامِ محفل"، قابلِ ذکر ہیں۔

اردو شاعری اور نظموں میں مہاتما گاندھی:

اردو نظموں کی بات کریں تو اردو ادب میں ایسی بے شمار نظمیں ہیں جس میں مہاتما گاندھی کو موضوع بنا کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ان میں ظفر علی خاں جو گاندھی جی کے معتقد تھے۔ان کی نظم اعلانِ جنگ قابل ذکر ہے:

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریباں کر دیا
سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پر
خنجر کو پھر حوالہ شیطان کر دیا
ہندوستان میں ایک نئی
آزادی حیات کا سامان کر دیا

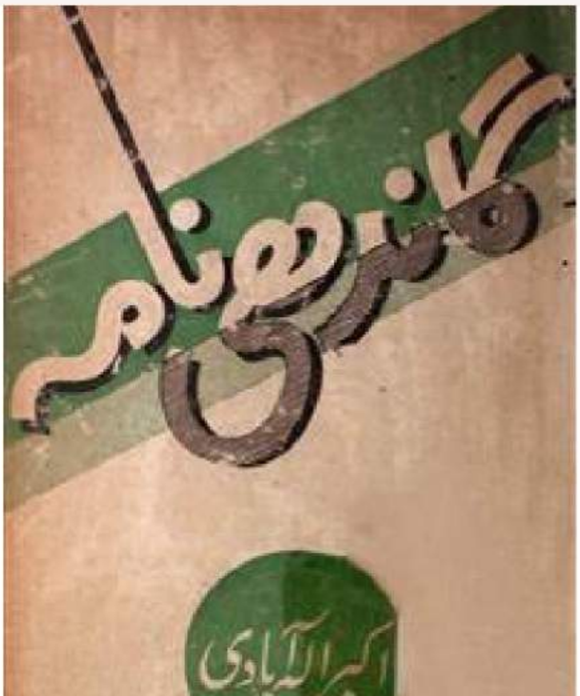

آبادی نے نظموں کا ذخیرہ کیا جس میں گاندھی جی کے طریقوں کو اپنی زندگی میں عمل میں لانے کی تلقین نظر آتی ہے۔گوپی ناتھ امن نے اپنی کتاب" عقیدت کے پھول" میں ان تمام نظموں کا مجموعہ جس میں اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال، پنڈت نرائن چکبست، تلوک چند محروم، مولانا ظفر علی

خان، مولانہ عزیز لکھنوی، امن لکھنوی، بسمل سعیدی، مہر لال ضیاء فتح آبادی، فدا فیض آبادی ،سلیم ناطق، منوہر لال قمر،نسیم امروہوی اوران کے علاوہ دیگر نظم نگاروں کی نظمیں شامل ہیں جنھوں نے گاندھی جی کے لیے پر خلوص اور محبت بھرے الفاظوں کے موتیوں سے نظمیں پروکر انھیں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔اردو ادب میں گاندھی جی کی محبت میں لکھی گئی بے شمار نظمیں موجود ہیں۔

میاں محمد علی خاور نے اپنے مجموعے" گاندھی نامہ" میں کس خوبی سے ان کی تعریف کی ہے۔فرماتے ہیں:

مئے روحانیت سے دہر کو سرشار کرتا ہے
اہنسہ کی حسیں تعلیم کا پرچار کرتا ہے

وہ انساں جس کا دل لبریز ہے صہبائے اُلفت سے
وہ جس کا قلب مضطر داغ ہے سوزِ محبت سے

جو اربابِ جہاں کو صلاح کا پیغام دیتا ہے نگاریں
بادۂ صدق و صفا کا جام دیتا ہے

یہ کہتا ہے تمھاری جیت ہوگی انکساری سے کرد
خلق خدا کے دل میں گھر پرہیزگاری سے

ان کے علاوہ بے شمار نظمیں اردو ادب میں موجود ہیں جیسے:

ساحر لدھیانوی کی نظم۔

گاندھی ہو یا غالب ہو۔۔۔۔۔گاندھی ہو یا غالب ہو

(گاندھی ہو یا غالب ہو)

جگر مرادآبادی کی نظم۔

وہی ہے شور ہائے وہی۔۔۔۔وہی ہجوم مردوزن

(گاندھی جی کی یاد میں)

نشور واحدی کی نظم ۔

شب ایشیا کے اندھیرے میں۔۔۔سر راہ جس کی تھی روشنی

(مہاتما گاندھی)

عادل جعفری کی نظم۔

ایک آدھ سال سے ہے فضا ملک کی کچھ اور
غالب صدی کے بعد ہے گاندھی صدی کا دور۔۔۔

(ذکرِ گاندھی)

بسمل الہٰ آبادی کی نظم۔

سنا رہا ہوں تمھیں داستان گاندھی کی ۔۔۔۔۔(مہاتما گاندھی)

آفتاب رئیس پانی پتی کی نظم۔

سوراج کا جھنڈا بھارت میں گڑوا دیا بابا نے ۔۔۔(بابا گاندھی)

عرش ملسیانی کی نظم۔

بھول گئی ہے آج تو رہبر حق نگاہ۔۔۔۔۔۔۔(گاندھی جینتی)

نازش پرتاپ گڑھی کی نظم۔

سلام اے افق ہند کے حسین تاروں ۔۔۔(گاندھی جی کی آواز)

اقبال سہیل کی نظم۔

وہ حدیث روح پیام جاں جسے ہم نے سن کے بھلا دیا (گاندھی)

روش صدیقی کی نظم۔

مسافر ابدی کی نہیں کوئی منزل ۔۔۔(مہاتما گاندھی)

سیدہ فرحت نے اپنی نظم " گاندھی جی" میں نہایت ہی خوبصورتی سے گاندھی جی کا درس سمجھایا۔کہتی ہیں:

سچی بات ہمیشہ کہنا سچائی کے رستے چلنا
باپو نے سمجھایا ہے باپو نے سمجھایا ہے

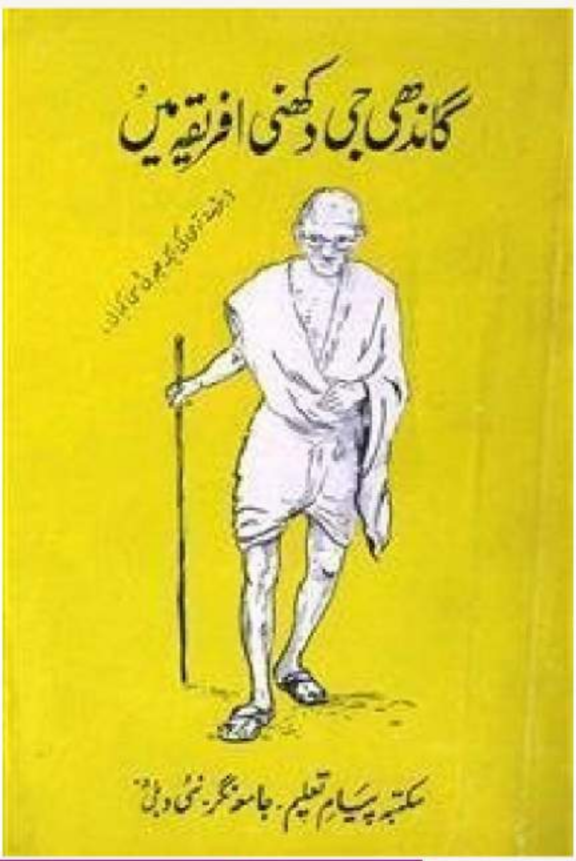

اوران تمام کے علاوہ بھی کئی نظمیں موجود ہیں جس سے اردو ادب پر گاندھی جی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔بے شمار شعرا نے گاندھی جی کی عظیم شخصیت پراوران کی تعریف میں اشعار کہے۔آنند نرائن ملا، سلام مچھلی، ساغر نظامی، سیماب اکبر آبادی، حرمت الاکرام، رام پرکاش راہی، جوش ملیح آبادی، حفیظ بنارسی، اعظم حسین، نثار علوی، چندر بھان خیال ان سب نے نظمیں لکھیں جس میں ان کی شخصیت کے علاوہ ان کی تعلیمات پر عمل اوران کی شہادت پر بین نظر آتا ہے۔

گاندھی جی کے انتقال پر ہر اردو شاعر گہرے افسوس میں نظر آیا۔ ان کی نظموں میں وہ درد اور غم جھلک رہا تھا۔اسرار الحق مجاز ان کی یاد میں لکھتے ہیں

دردو غم حیات کا درمن چلا گیا　　وہ خضر عصر وعیسی دوراں چلا گیا
ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا　　انسان کی جستجو میں انساں چلا گیا

اسی افسوس میں نشور واحدی لکھتے ہیں:

شب ایشیا کے اندھیرے میں سرراہ جو تھی روشنی
وہ گوہر کسی نے چھپا لیا وہ دیا کسی نے بجھا دیا

آنند نرائن ملا لکھتے ہیں۔

مشرق کا دیا گل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سن سا ہو جاتا ہے ہر سانس تھراتی ہے

نظیر بنارسی اپنی نظم" آہ گاندھی" میں گاندھی جی کے انتقال پر ماتم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تیرے ماتم میں شامل ہے زمین و آسماں والے
اہنسا کے پجاری سوگ میں ہے دو جہاں والے

اردو نثر اور اردو نظم میں گاندھی جی کی زندگی کی عکاسی صاف طور پر نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ تو تھی ہی کہ گاندھی جی کی شخصیت ہی ایسی تھی جن سے ہر ہندوستانی کو عقیدت اور محبت تھی ۔ ہر شاعر اور ادیب ان کا قائل تھا اور ان کے لیے احترام اور عزت رکھتا تھا۔

ساجد صدیقی اور والی آسی کی مرتب کردہ کتاب" رہبر ایشیا" میں ہندوستان کی نامور شخصیات کے وہ الفاظ جوانھوں نے گاندھی جی کے اس دنیائے فانی سے گزر جانے پر کہے تھے۔ان کا ذخیرہ کیا اوراس ماتم پر لکھی نظموں کا مجموعہ پیش کیا۔اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں:

" مہاتما گاندھی کے سانحہ وفات نے میرے ذہن ودماغ کو ماؤف کر دیا۔آج جب کہ گاندھی جی نے اپنا آخری سفر تمام کر لیا۔ہم ایک نئے سفر پر گامزن ہو گئے۔"

گاندھی جی کے لیے لکھنا یا ان کے مطابق لکھنا ادیب وشاعر کے لیے فخر کی بات تھی اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا جیسے گاندھی جی کی یاد ہمارے دلوں سے اوران کا نام اس دنیا سے کبھی ختم نہیں ہوگا۔

حوالہ جات:

انو بندھو پادھیائے،" گاندھی جی کے مختلف روپ"، مترجم شکیل اختر فاروقی، نئی دہلی۔
اسرار احمد آزاد،" گاندھی جی"، 1948، نئی دہلی،
روشن لال،" گاندھی جی کے تاریخی خطوط"
عبداللطیف اعظمی،" گاندھی جی اوران کے خیالات"، 1970، نئی دہلی
عشرت علی صدیقی،" گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ"، 1980، اتر پردیش
گوپی ناتھ امن،" عقیدت کے پھول"، 1969، نئی دہلی
قدسیہ زیدی،" گاندھی بابا کی کہانی"، 1976، علی گڑھ
میاں محمد رفیع خاں خاور،" گاندھی نامہ"، جالندھر
یو آر راؤ،" ایسے تھے گاندھی جی"، 1969، نئی دہلی۔
یوصف ناظم،" گاندھی جی دکھنی افریقہ میں"، نئی دہلی

Zarina Abdul Salim
Assistant Professor
Yashoda Girls' Arts and Commerce
College, Sneh Nagar
Nagpur -440015 (M.S)
Contact No: 9322444311/8208251764

آفاق عالم صدیقی

نسائیت کی بے توقیری کے خلاف احتجاج

شائستہ یوسف کی بے لوث اور بے پناہ خود اظہاریت کی حامل نظمیہ اور غزلیہ شاعری عموماً ان کے باطنی کرب اور خود آگہی کی میٹھی آگ سے سلگتی محسوس ہوتی ہے۔ جوان کے وجود کے جوہر کا احساس دلاتی ہے۔ ان کی شاعری کا خمیر تاریخ، روحانیت اور نسائیت کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ لیکن اس شاعری کا بنیادی لحن نسائیت کی بے توقیری کے خلاف احتجاج ہے۔ جس میں ان کی شخصیت کے نمود کی شدید ترین خواہش کی تپش اور درماندہ روح کی پاکیزہ مہک کا احساس اس طرح گھل مل گیا ہے کہ کسی کو کسی سے الگ کر کے دیکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔

شائستہ یوسف کی شاعری کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ یہ شاعری کسی ٹھوس زمین پر قدم جما کر کھڑی نہیں ہے۔ یہ شاعری جس زمین سے انکھوئے کی طرح پھوٹی ہے وہ زمین دراصل شائستہ یوسف کی روح ہے۔ ایک زخمی اور بے قرار روح، ان کی پوری شاعری کا مطالعہ کر لیجئے آپ محسوس کریں گے کہ ان کے یہاں ہر چیز بدلتی ہے۔ چاند نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے۔ خوشبو پھوٹتی ہے اور بے نشان ہو جاتی ہے۔ ندی بل کھاتی ہے اور شانت ہو جاتی ہے۔ بادل برستا ہے اور اپنے بوجھ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ روشنی تاریکی میں اور تاریکی روشنی میں ڈھل جاتی ہے۔ بنجر زمین زرخیز بن جاتی ہے۔ خدا اپنی رحمتوں کے ساتھ زمین پر اتر آتا ہے۔ زمین اپنی بلند تقدیر پر مسکرا اٹھتی ہے۔ عشق، محبت، خود سپردگی، اور آسودگی کے گلاب اپنے آپ کھل اٹھتے ہیں۔ مگر نسائیت کی روح اپنی تقدیس کی معراج کو نہیں پہنچ پاتی ہے۔ عہد، زمانہ اور وقت بدل جاتا ہے، ہر موسم اپنا اپنا رنگ دکھا کر گزر جاتا ہے۔ مگر نسائیت کی روح کی کائنات میں بہار نہیں آتی ہے۔ یہی دکھ کا وہ سرچشمہ ہے جس سے شائستہ یوسف کی شاعری کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ شائستہ یوسف کی شاعری کسی ٹھوس زمین پر قدم جما کر نہیں کھڑی ہے۔ یہ شاعری اس سینے سے پھوٹ کر نکلی ہے جس میں انسانیت کی پامالی، تاریخ کے مختلف ادوار کی انسانیت سوز کہانی، مذہبی افکار اور مذہبیت کی شدّت پسندی کی پشیمانی، رشتوں کی تقدیس کے نام پر سب کچھ لٹا کر کچھ نہ پانے کی حیرانی، اور جان و دل سے عزیز اپنوں کی نشتر زنی سے پیدا ہونے والی کراہ کا بسیرا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ شاعری شعلہ پائی کے سفر کی داستان ہے جس میں نسائیت کی تحریم و تکریم کی خوگر بے اماں روح کی پھڑ پھڑاہٹ قاری کو بے سکونی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

یہ کیسا کھیل ہے
افکار کے آئینے میں

....

ذہن اس آئینے سے

افکار کے عکس سمیٹتا ہے
نقوش بننے لگتے ہیں
اور باتیں حاملہ ہو جاتی ہیں
یہ حاملہ بے چینی سے بے قراری میں
اپنے رحم کا بوجھ
ہلکا کرنے کی راہ تلاش کرتی ہے
(نجات)

تم گوتم بدھ بن کر
اس پیڑ کی گھنی چھاؤں میں
میرے آگے آنکھیں موندے بیٹھے رہو
اور میں
تمھارا دل بن جاؤں
(عشق کا رنگ)

بہتی ہوئی ندی کا
حسین، چمکیلا
کسا ہوا
بے داغ بدن
تکبر کا لبریز پیمانہ بنا
بہہ رہا تھا
ایک بچے نے
کنکر پھینکا
اور ندی کا بدن
جھریوں سے بھر گیا
(حسن تیری عمر ہی کیا)

جذبات سے عاری بے چہرہ وجود
میلے دانتوں سے
قوام زدہ بہتی رال
اور میری بے بس آنکھوں میں
روزانہ دکھائی دینے والے
اس نظارے کو قتل نہ کر پانے کی مایوسی
(میں نے پھر قبول کیا)

شائستہ یوسف کے دل و دماغ میں بیشتر زندگی کے تجربے اور بھوگے ہوئے لمحے تحریک پیدا کرتے ہیں، مگر یہ تجربے اور بھوگے ہوئے لمحے اتنے جاں گسل ہیں کہ لگتا ہے اب سب کچھ ختم ہو جائے گا مگر اسی وقت زندگی کی حیرتنا کی سارے پردے چاک کر کے مسکرانے لگتی ہے کیونکہ شائستہ یوسف کے تجربوں اور بھوگے ہوئے لمحوں کے پیچھے اجتماعی لاشعور، تاریخی شعور اور نسائیت کے ارفع ترین شعور کا غیاب بہت گھنا ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں وضاحت اور صراحت کا نہیں، بلکہ ابہام اور کنایوں کا بول بالا ہے۔ تجسس، اسرار اور جذبات و احساسات کی مٹی مٹی سی دھندلی کائنات میں مضطرب روح کی ان سلجھی پہیلیوں اور ان بوجھی باتوں کی روشن علامتوں اور قرنوں کی قہر سامانیوں سے گونجتے استعاروں کا کارواں رواں دواں ہے۔ شائستہ یوسف خود لکھتی ہیں کہ؛

> ''اسرار و رموز، غیاب، ان دیکھی دنیاؤں کا تصوّر میری روح کی غذا ہے۔ میری بے چینیاں، میری تڑپ کیا چاہتی ہے، اب تک ان جذبات کو الفاظ کا جامہ نہیں مل سکا، میرے اشک حوا سے لے کر ابد تک باقی رہنے والی خواتین کے اشک کا حصّہ ہیں۔ میں ان ساری مخلوق کا آئینہ ہوں جو ازل تا ابد سفر میں ہے۔ اتنے چہروں سے اپنے چہرے کو منفرد رکھنا کائنات کے وسیع و بلیغ آئینے سے ایک قطرہ پارہ اٹھانا اور اپنی شناخت بنانا آسان نہیں ہے۔ ہر لمحہ میری روح صدیوں کا سفر کرتی ہے۔ جنت کی نہروں اور ٹھنڈی ہواؤں کا تو کبھی دوزخ میں بہتے گندھک کی جلتی دریاؤں کا۔''

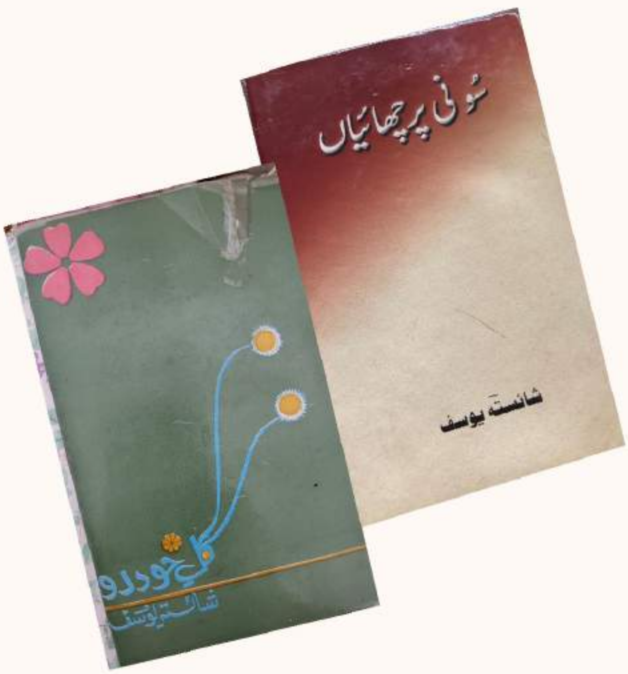

شائستہ یوسف کی نظموں کا غیاب بھی قاری سے یہی سوال کرتا ہے کہ ان نظموں کے حرف وصوت میں بسی بے چینیاں اور تڑپ کیا چاہتی ہیں؟ کیا نسائیت کی مجروح روح کے کرب اور اس کی بے پناہی کو دنیا کی کسی بھی زبان کے الفاظ مصور کر سکتے ہیں؟ حوا سے لے کر ابد تک خواتین کی آنکھیں کیا اسی طرح اشکبار رہیں گی؟ کیا ممتا، محبت، خودسپردگی، اور کائنات کے تعمیری حسن میں چار چاند لگانے اور زندگی کو اگلے پڑاؤ تک لے جانے کے لیے نئے ممبروں کو خلق کرنے اور اسے اپنا خون جگر پلا کر پالنے کا صلہ یہی ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس سرزمین پر انجام دیا جانے والا ہر جرم، ہر واردات نسائیت کی مہربان اور پاکیزہ روح کی تذلیل ہے۔ یہ ایسا ناسور ہے جو ہمیشہ اسی طرح درد بن کر نسائیت کے سینے سے بہتا رہے گا:

نئی کائنات، نئی فتوحات کے لہراتے پرچم
کارٹون اور زندہ لوگوں میں مماثلت
فرد کی شناخت غائب
میرے بدن میں تبدیلی کا احساس
ہیجان انگیز واقعے کی سماعت میں دستک
حاملہ بدن پر
گولیاں برسانے کو تیار کھڑے روبوٹ
اپنی پھولی ہوئی ناک، پھیلے پستان، ابھرے بطن پر
حجاب ڈالنے کی بے چینی

....

میں منتظر ہوں ایک بڑے جشن کی
میرے بچے کے جنم کی
اس نئے بچے کی
جس کے رونے کی آواز
قہقہوں پر حاوی ہو جائے
گریہ زاری اس پہاڑ میں مقید
دریائے نیل کو اسرے نو بہادے

(بائیسویں صدی)

یہ جو نسائیت کی، بطن کی، اور بطن مادر سے جنم لینے والے بچوں کی بے توقیری کا سلسلہ ہے۔ یہ ایسا غم ہے جو ممتا اور نسائیت کے روح کے صحرا میں ہر آن بگولے کی طرح اٹھتا ہے کیونکہ اس بے توقیری حق بہ جانب ٹھہرانے والے بھی وہی ماں جائے ہیں جنھوں نے شیر مادر کی بے توقیری کو اپنا شیوہ بنالیا ہے۔

کیا یہ ممتا اور نسائیت کی بے توقیری نہیں ہے کہ جب کوئی ماں کسی بچے کو جنم دیتی ہے اس کے لیے عالمی سطح پر کوئی جشن نہیں منایا جاتا ہے۔ اس نئی زندگی کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں دی جاتی ہے۔ فطرت کی خالقیت اور ممتا و نسائیت کی عظمت اور ایثار کا کوئی ترانہ نہیں گایا جاتا ہے۔ البتہ فرعونیت کے سارے حربے اپنائے جاتے ہیں۔ جبکہ مصنوعی چیزوں، ہلاکت خیز ایجادوں، خوں آشام ہتھیاروں اور انسانیت کو مٹا دینے والی مشینوں کی ایجاد پر ساری دنیا میں چراغاں کیا جاتا ہے۔

عورت جو فطرتاً خالق ہے، اس کائنات کی تعمیر کے نغموں اور سرخوشیوں کی محافظ ہے اس کی روح کو کچلا جاتا ہے۔ شائستہ یوسف کا کرب دراصل کائنات کی تعمیر اور حسن تعمیر کو تخریب میں بدل دینے والی قوتوں کا بخشا ایسا کرب ہے جس میں ساری عورتوں کا کرب شامل ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی شاعری میں فلسفے کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ تفکر اور تدبر کی رمق کا احساس بھی ہوتا ہے۔ تاریخ، مذہب، منتھ، اساطیر بھی اپنی موجودگی پر اسرار کرتے ہیں مگر ان ساری چیزوں کے پس پردہ خالقیت بہ معنیٰ نسائیت کی بے توقیری کی تڑپھڑاہٹ کی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں۔

شائستہ یوسف کی شاعری اپنے ہم عصروں کی شاعری سے کچھ الگ ہٹ کر نظر آتی ہے تو اس کی ایک وجہ اس کی دھاردار انفرادیت ہے جو پھیل کر اس کی انانیت کی جراحت تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر شائستہ یوسف کی انا کسی تارک الدنیا صوفی یا بیراگی کی انا نہیں ہے، وہ خاص الخاص واردات اور تجربات کی انا ہے۔ ایسی انا جس کے جمال میں لاکھوں باشعور اور حساس اور اپنی زندگی سے غیر مطمئن افراد و اشخاص کی تفصیل پوشیدہ ہے۔ شائستہ یوسف کی شاعری بہ ظاہر بہت پیچیدہ تہہ دار، اور کہی ہوئی باتوں میں ان کہی باتوں کا استعارہ جیسی شاعری ہے مگر حقیقتاً یہ بہت صاف روشن اور تمثیلی شاعری ہے جس کے عقب میں نسائیت کی ناقدری و بے حرمتی کی کائناتیں آباد ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے بند مٹھیوں میں پھر کچھ نئی لکیریں ہیں:

چیختی چھتوں سے بھی
جھانکتی ہوئی آنکھیں
مجھ پہ وار کرتی تھیں
ہوش مند تھے کہ دیوانے
کیا وہ سب میری خاطر
آگ سے لپٹتے تھے
بے بدن اگر میں تھی
کیوں بدن کا تھا احساس

یہ نظم اپنی فنکارانہ بنت سے زیادہ اپنے اظہار کی بے ساختگی کی وجہ سے ایک خاص طرح کی جادواثری رکھتی ہے اور بتاتی ہے کہ انسانی روح ہزار طرح کے ابتلا سے گزر کر بیت المامون تک پہنچتی ہے مگر آوارگی اسے پھر سے اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

شائستہ یوسف کی نظم ''حجاب'' قابل توجہ ہے۔ عورت میں خالقیت کا جو مادہ ہے، اور خالق ہونے کے احساس میں جو سرشاری اور برتری کی کیفیت پائی جاتی ہے اسے تخیل کے سنہرے پروں پر اڑتے اور قوس قزح کے رنگوں میں گھلتے دیکھنا مشکل تو نہیں ہے مگر اس سرخوشی کو لفظوں کی گرفت میں لانا آسان بھی نہیں ہے۔ ذہن و دل یعنی احساس اور جذبہ کرب اور لذت جب حل ہو کر ایک ہو جاتے ہیں تو تخلیقیت خیزی کی وہ قوت پیدا ہوتی ہے جسے ماں کہا جاتا ہے۔ ماں جو سرسوتی ہے، لکشمی ہے، کالی ہے، درگا ہے، مریم ہے، سیتا ہے، اور آسیہ ہے۔ ماں جب تک ممتا سے لبریز رہتی ہے ذہن و دل کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا ہے مگر جب من و تو کا فاصلہ بڑھنے لگتا ہے، اور شیطان کی مسکراہٹ گہری ہو جاتی ہے تو روح بنجر ہو جاتی ہے اور ایک چہرے کا عکس کئی چہروں میں بٹ جاتا ہے۔ وہ چہرہ آدم کا ہو کہ حوا کا۔ فرعون کا ہو کہ یوسف کا، نمرود کا ہو کہ ابراہیم کا۔ ہٹلر کا ہو کہ عیدی امین کا، موسیٰ کا ہو کہ یزید اور عیسیٰ کا۔

شائستہ یوسف نے اپنی شاعری کے بارے میں کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے اور نہ اپنے منفرد ہونے پر اصرار کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں دنیا کی اور دنیائے ادب کی حقیقت کا علم ہے کیونکہ ادب کی حد تک انفرادا ور اجتہاد محض سراب ہے اور بالکل نئی راہ تلاشنے اور خود اظہاریت کی بالکل نئی سبیل نکالنے کی ضد محض بچکانہ ہے۔ بقول سلیم الرحمٰن؛

''یہ احساس بہت پرانا ہے کہ ہر شے کو ضرورت سے زیادہ نچوڑ اور چھوڑا جا چکا ہے۔ اور اس میں ست باقی نہ رہا، اتنا پرانا کہ اس سے دو چار ہونے پر ہول اٹھتا ہے۔ کیا واقعی انسان اس قدر جلد اکتاہٹ کا شکار ہو گیا تھا یقین نہ آئے تو کاخ پیرے نامی ایک مصری کاتب کی یہ عبارت پڑھ لیجئے جو دو ہزار قبل مسیح میں لکھی گئی تھی کہ؛

''اے کاش مجھے ایسے کلمات پر دسترس ہوتی جن سے اور کوئی واقف نہ ہوتا، کسی نئی زبان میں جسے ابھی برتا نہ گیا ہو، تکرار سے آزاد، انوکھی عبارتیں غرض کہ کوئی ایسا کلام جسے متقدمین کی زبان سے ہرگز علاقہ نہ ہو۔''

آج سے بہت پہلے کسی کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ زبان میں پہلے جیسی رمق باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیے اگر آج کوئی فنکار اس قسم کی بات کرتا ہے تو وہ پرانی ہی بات دہرا رہا ہوتا ہے۔

شائستہ یوسف کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے عورت کی زخمی روح اور مجروح انا، اس کے اظہار کے لیے وہ بہت سارے طریقے اور حربے اپناتی ہیں کبھی تاریخ کے گم گشتہ اوراق و کردار کو اپنے اظہار کے وسیلے کے طور پر اپنی شاعری کی خوراک بناتی ہیں تو کبھی حسن و عشق کے تجربے کی نا آسودگی و پامالی سے پھوٹنے والی کرب کی لہروں کو مگر انجام سب کا ایک ہی ہوتا ہے عورت کی روح کا تشنہ رہ جانا اور اس کی نسائیت کی بے توقیری، قابل توجہ بات یہ ہے کہ شائستہ یوسف اپنی نظمیں اس طرح بنتی ہیں کہ روز مرہ کا واقعہ بھی ادبی اور تخلیقی حسن کا شاہکار نظر آنے لگتا ہے اور اس میں ایسی کشش، تہہ داری، اور معنیٰ خیزی پیدا ہو جاتی ہے کہ شاعری سچ مچ اپنی بلند تقدیر کی حامل نظر آنے لگتی ہے۔

کیسے جھانکوں خوشی کی آنکھوں میں
مجھ سے نظریں نہیں ملاتی ہے

❑❑❑

Dr. Afaque Alam Siddiqui
Zubaida Degree College
Jai Nagar, Shikaripur
Shimoga-577427 (Karnataka)
afaquealamsiddiqui550@gmail.com

علی گڑھ تحریک اور تعلیم نسواں

ڈاکٹر محمد فیروز عالم

تعلیم کو اکثر ذاتی اور معاشرتی ترقی کا سنگ بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت محض تعلیمی کامیابی سے بالاتر ہے۔ بلکہ اس میں تنقیدی سوچ کی آبیاری، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیتیں، اور علم کی پیاس شامل ہے۔ معاشی خوشحالی کو فروغ دینے سے لے کر سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینے تک، تعلیم کے فوائد کثیر جہتی اور گہرے ہیں۔ تعلیم وہ کلید ہے جو مواقع کے ان گنت دروازے کھول دیتی ہے۔ یہ افراد کو علم اور ہنر سے آراستہ کرتی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو بڑھانے اور معاشرے میں بامعنی حصے کے لیے بیحد ضروری ہے۔ تعلیم کے ذریعے لوگ مختلف شعبوں میں خصوصی مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ ملازمت میں ترقی کی راہیں کھول سکتے ہیں۔ مزید برآں تعلیم افراد کو اپنی صحت اور مجموعی فلاح و بہبود کے بارے میں فیصلے کرنے کا اختیار دیتی ہے۔ اس طرح یہ مزید بھرپور زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہے۔ تعلیم معاشی ترقی اور ترقی کے پیچھے ایک محرک قوت ہے۔ اچھی طرح سے قائم تعلیمی نظام والی قومیں صلاحیت، جدت طرازی اور تکنیکی ترقی کے اعلیٰ درجے کا تجربہ کرتی ہیں۔ تعلیم میں سرمایہ کاری کر کے ممالک ایک ہنر مند افرادی قوت تیار کر سکتے ہیں جو متنوع صنعتوں کو آگے بڑھانے کے قابل ہو۔ تعلیم انٹر پرینیورشپ کو فروغ دیتی ہے ساتھ ہی جدت طرازی کی ثقافت کو فروغ دیتی ہے جو پائیدار معاشی خوشحالی کی بنیاد رکھتی ہے۔ تعلیم سماجی نقل و حرکت کو فروغ دینے اور عدم مساوات کو کم کرنے کے لیے ایک طاقتور ذریعہ کے طور پر کام کرتی ہے۔ یہ افراد کی سماجی و اقتصادی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ معیاری تعلیم تک رسائی پسماندہ کمیونٹیز اور خواتین کو بااختیار بناتی ہے، انھیں غربت سے آزاد ہونے کے قابل بناتی ہے۔ تعلیم تفہیم، رواداری اور تنوع کو فروغ دے کر سماجی ہم آہنگی قائم کرتی ہے۔ اس طرح ایک زیادہ جامع معاشرے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

آج کی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں تنقیدی انداز میں سوچنے اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ تعلیم افراد کو علمی مہارتوں اور تجزیاتی صلاحیتوں سے آراستہ کرتی ہے جو ایک بڑھتے ہوئے باہم جڑے ہوئے اور معلومات سے بھرپور ماحول کو نیویگیٹ کرنے کے لیے درکار ہے۔ تعلیم تجسس، تخلیقی صلاحیتوں اور موافقت کو فروغ دے کر افراد کو اعتماد کے ساتھ مستقبل کے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے تیار کرتی ہے۔ تعلیم ہی ذمہ دار عالمی شہریوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے جو امن اور انصاف کو فروغ دیتی ہے۔ اس کے ذریعے افراد ماحولیاتی تبدیلیوں، غربت اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں جیسے عالمی مسائل کے بارے میں آگاہی پیدا کرتے ہیں۔ مثبت عمل کرنے کی ترغیب بھی دیتے

ہیں۔علاوہ ازیں تعلیم ہمدردی اور سماجی ذمہ داری جیسی اقدار کو جنم دیتی ہے جس سے دنیا بھر کے لوگوں میں یکجہتی اور باہمی ربط کے احساس کو فروغ ملتا ہے۔خواتین کی تعلیم محض علم کی فراہمی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک بنیادی انسانی حق اور معاشرتی ترقی اور ترقی کا ایک اہم محرک ہے۔ پوری تاریخ میں خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، جس کی جڑیں ثقافتی اصولوں، سماجی واقتصادی اور صنفی امتیاز میں پیوست ہیں۔ تاہم صنفی مساوات کو فروغ دینے اور تعلیم کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے مشترکہ کوششوں نے دنیا بھر میں خواتین کی مواقع تک رسائی میں اہم پیش رفت کی ہے۔اس مضمون میں خواتین کی تعلیم کی اہمیت، سماج پر اس کے اثرات اور چیلنجز سے بحث کی گئی ہے۔بہت سے معاشروں میں خواتین کو رسمی تعلیم سے محروم رکھا گیا ہے، جس کے سبب فکری بالیدگی اور سماجی شعور متاثر ہوئے ہیں۔ ثقافتی اصولوں نے اکثر خواتین کو گھریلو ذمہ داریوں تک محدود رکھا، جس سے ان کی اسکول اور کالج تک رسائی حد درجہ متاثر ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ سماج میں غربت اور عدم مساوات قائم رہا۔ تاہم سماجی اصلاحی تحریکوں اور خواتین کے حقوق کی آواز کے نتیجے میں ان کو بااختیار بنانے میں تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

خواتین کی تعلیم سے سماج پر دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ تعلیم خواتین کو علم، ہنر اور اعتماد سے آراستہ کرتی ہے کہ وہ معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی میں مکمل طور پر حصہ لے سکیں۔ یہ انھیں اپنی صحت، خاندانی منصوبہ بندی، اور معاش کے بارے میں بہتر فیصلے کرنے کے قابل بناتی ہے، جس سے ماں اور بچے کی صحت کے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں اور یہ غربت کی طویل راتوں سے نکالنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔تعلیم یافتہ خواتین سماج میں برابر کی شراکت داری سے اور اپنی صلاحیتوں سے معاشی نمو اور ترقی میں اپنا حصہ ڈالنے کا زیادہ امکان رکھتی ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر خواتین تبدیلی اور ترقی کی راہ میں نمایاں رول ادا کرتی ہیں۔ معاشرے کو بہتر سے بہتر بنانے میں جذباتی کردار نبھاتی ہیں۔خواتین کی تعلیم کے ناقابل تردید فوائد کے باوجود متعدد چیلنجز برقرار ہیں جو تعلیم میں صنفی مساوات کی جانب پیش رفت میں رکاوٹ ہیں۔خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں غربت اور مالی وسائل کی کمی کے ساتھ ساتھ اقتصادی رکاوٹیں اکثر لڑکیوں کو تعلیم تک رسائی سے روکتی ہیں۔ سماجی اور ثقافتی اصول جو لڑکوں کی تعلیم کو لڑکیوں پر ترجیح دیتے ہیں تعلیمی حصول میں تفاوت کو مزید بڑھاتے ہیں۔صنفی بنیاد پر تشدد، کم عمری کی شادی اور سماجی توقعات اکثر لڑکیوں کو وقت سے پہلے اسکول چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔انھیں اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کے مواقع سے محروم کر دیتے ہیں۔ تعلیمی اداروں اور دفاتر میں امتیازی سلوک اور تعصب بھی خواتین کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں جس سے ان کی اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ ترقی کے مواقع محدود ہوجاتے ہیں۔خواتین کی تعلیم کو فروغ دینے میں حکومتیں اور سول سوسائٹی کی تنظیمیں معیاری تعلیم تک رسائی میں اہم کردار ادا

کرسکتی ہیں۔

انفراسٹرکچر، اساتذہ کی تربیت اور اسکالرشپ خواتین کے لیے تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے میں مدد کرسکتی ہے۔ صنفی دقیانوسی تصورات کو چیلنج کرنا خواتین کے سیکھنے اور ترقی کرنے کے لیے ایک معاون ماحول پیدا کرنے کے لیے ضروری اقدامات ہیں۔

سرسید تحریک جس کی سربراہی سرسید احمد خان نے کی تھی، ہندوستانی تاریخ کا ایک تبدیلی کا دور تھا جس میں تعلیم کی اصلاح اور سماجی تبدیلی کو فروغ دینے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ اس تحریک کے زیر اثر تعلیم نسواں کو بھی زیر بحث لایا گیا۔ ایک ایسے معاشرے میں ایک انقلابی تصور جہاں خواتین کے کردار روایتی طور پر گھریلو شعبوں تک محدود تھے۔ اس تحریک کا خواتین کی تعلیم پر گہرا اثر ہوا۔ سرسید احمد خان ایک مصلح اور ماہر تعلیم کے طور پر انیسویں صدی کے دوران برطانوی ہندوستان میں ایک نمایاں شخصیت کے طور پر ابھرے۔ اپنے وقت کے سماجی و سیاسی اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کرتے ہوئے سرسید نے مسلم کمیونٹی کی ترقی کے لیے تعلیمی اصلاحات کی اہم ضرورت کو تسلیم کیا۔ ان کا نقطہ نظر محض علمی مشاغل سے آگے مسلمانوں کو جدید تعلیم اور منطقی سوچ کے ساتھ بااختیار بنانا تھا تاکہ نوآبادیاتی حکمرانی اور سماجی تبدیلی کے چیلنجوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔

انیسویں ویں صدی کے ہندوستان میں خواتین کی تعلیم کا عملی طور پر کوئی وجود نہیں تھا خاص طور پر مسلم کمیونٹیز میں۔ سماجی اصولوں اور ثقافتی رکاوٹوں نے خواتین کو اپنے گھروں تک محدود کردیا جس سے وہ رسمی تعلیم اور ترقی سے محروم تھیں۔ مروجہ ذہنیت خواتین کی تعلیم کو غیر ضروری یا روایتی خاندانی ڈھانچے کے لیے نقصان دہ تصور کرتی تھی۔ نتیجتاً معاشرے میں اس کے برے نتائج واضح نظر آرہے تھے۔ سماجی و اقتصادی ترقی کے مواقع سے محرومی ان کا مقدر ہوگئی تھی۔ پدرانہ نظام اور تعلیمی غفلت کے اس پس منظر میں سرسید احمد خان خواتین کی تعلیم کے ایک مصلح کے طور پر ابھرے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ مسلم معاشرے کی ترقی خواتین کو بااختیار بنانے اور سماجی و اقتصادی میدان میں ان کی فعال شرکت پر منحصر ہے۔ سرسید کا پختہ یقین تھا کہ خواتین کو تعلیم دینا نہ صرف ایک اخلاقی ضرورت ہے بلکہ سماج کا مستقبل بہت حد تک ان کی تعلیم سے ہی سنور سکتا ہے۔ سرسید کی تعلیمی اصلاحات کی کوششوں کا سنگ بنیاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کا قیام تھا۔ 1875 میں قائم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مقصد جنس یا سماجی و اقتصادی پس منظر سے قطع نظر مسلمانوں کو جدید تعلیم فراہم کرنا تھا۔ سرسید نے اے ایم یو کو روشن خیالی کے مرکز کے طور پر تصور کیا جہاں طلباء سائنسی علم، تنقیدی سوچ کی مہارت اور اخلاقی اقدار حاصل کرسکتے ہیں جو ذاتی اور سماجی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

خواتین کی تعلیم کے لیے سرسید کی کوشش کی سخت مخالفت کی گئی۔ روایت پسندوں نے ان کے اقدامات کو قائم کردہ صنفی اصولوں اور مذہبی رسومات کے لیے خطرہ کے طور پر دیکھا۔ ناقدین کا کہنا تھا کہ خواتین کو تعلیم دینا اخلاقی تنزلی کا باعث بنے گا۔ خاندانی اقدار کو چوٹ پہنچائے گا اور معاشرتی ڈھانچے کو غیر مستحکم کرے گا۔ ان چیلنجوں کے باوجود سرسید خواتین کی تعلیم کے لیے اپنے عزم پر ثابت قدم رہے۔ یکساں مواقع اور سماج کے سبھی طبقے تعلیم کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ علی گڑھ تحریک نے خاص طور پر خواتین کی تعلیم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرسید نے ہم خیال مصلحین کے ساتھ مل کر ایسے اسکول اور کالج قائم کیے جو خواتین کو جدید تعلیم فراہم کرسکے۔ ان اداروں نے ایک ایسا ماحول فراہم کیا جہاں لڑکیاں اپنی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں اور تعلیمی فضیلت سے ہمکنار ہو سکیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواتین کی تعلیم پر سرسید تحریک کے اثرات گہرے اور دور رس ہیں۔ خواتین کو فکری طور پر بااختیار بنانے کی وکالت کرتے ہوئے سرسید نے تعلیم، ادب اور عوامی خدمت سمیت مختلف شعبوں میں خواتین کی شرکت کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ علی گڑھ تحریک کے تحت قائم ہونے والے تعلیمی ادارے سماجی تبدیلی کے لیے نشان راہ بن گئے جن سے تعلیم یافتہ خواتین کی نسلیں آج بھی سماجی فلاح و بہبود میں نمایاں کردار ادا کررہی ہیں۔

سرسید تحریک سماجی اصولوں کو چیلنج کرنے اور سماجی تبدیلی کو فروغ دینے میں ثبوت کے طور پر آج بھی کھڑی ہے۔ خواتین کی تعلیم کے لیے سرسید احمد خان کی وکالت اپنے وقت میں انقلابی تھی جس نے ہندوستانی معاشرے میں صنفی مساوات کو بااختیار بنانے کی بنیاد رکھی۔ ان کی کاوشیں خواتین کو تعلیم حاصل کرنے، دقیانوسی تصورات سے نبٹنے اور اپنی برادریوں کو بڑے پیمانے پر دنیا کے لیے بامعنی کردار ادا کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

□□□

Dr. Md Firoz Alam
Assistant professor,
Colleg of Teacher Education
MANUU, Ilyas Nagar chandanpatti
Laheriasarai
Darbhanga-846001 (Bihar)

این عارف

ایلیزبتھ کورین مونا
ملیالی اردو شاعرہ

جنوبی ہند میں کیرالا ایک ایسی ریاست ہے جہاں سب باشندوں کی بولی، سمجھی، لکھی اور پڑھی جانے والی زبان 'ملیالم' ہے۔ کیرالا میں ہندو، مسلم، عیسائی، بدھ اور جین مذاہب کے لوگ یکساں طور پر ملیالم زبان استعمال کرتے ہیں۔ ایسی ریاست میں اردو زبان کی ترقی و ترویج بے شک ایک معجزہ ہی ہو سکتی ہے۔ ایسی ریاست سے ایک عیسائی اردو شاعرہ پیدا ہوئیں وہ ہے ایلیز اتھ کورین مونا۔

ہمیں معلوم ہے کہ شاعری کا نہ مذہب ہوتا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی زبانیں ہیں وہ سب اپنے اپنے علاقے میں انسانوں کے آپس میں رابطے اور تعلقات کو استوار کرنے کا کردار ادا کرتی ہیں۔ ان زبانوں کا نہ تو کسی مذہب سے اور نہ کسی فرقہ سے اور نہ ہی کسی خاص علاقہ سے تعلق ہوتا ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے یہ زبان کئی زبانوں کے سنگم سے بنی ہے اسے لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے۔ اردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں عربی، فارسی اور ہندی کے سیکڑوں الفاظ ہیں تو وہی اس زبان میں پنجابی سندھی سنسکرت سرائیکی بھوجپوری، مراٹھی گجراتی، تلگو کنٹر کے علاوہ انگریزی الفاظ بھی شامل ہیں اس طرح اردو کی پیدا وار کئی زبانوں کے میل جول سے ہوئی۔ اس زبان کو ہندو مسلم سکھ عیسائی اور دیگر اقوام سب ہی نے اپنایا۔ اس کی وجہ اس زبان کی چاشنی اور لطافت ہے۔

ایلیزبتھ کورین مونا موجودہ دور کی معروف شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ کئی زبانوں میں مہارت رکھتی ہیں۔ جن میں اردو، انگریزی، ہندی، تلگو اور ملیالم شامل ہیں۔ ان زبانوں میں وہ شاعری، نثر اور ترجمہ بآسانی کر لیتی ہیں۔ مونا کی مادری زبان ملیالم ہے۔ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ موجودہ دور کی غیر مسلم اردو شعراء میں ایک نمایاں نام ایلیزبتھ کورین مونا کا بھی ہے۔ ان کا آبائی وطن کیرالا ہے لیکن فی الحال وہ حیدر آباد میں مقیم ہیں۔ پروفیسر کرامت علی کرامت لکھتے ہیں:

> "ہمارے ملک میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو دس دس بارہ بارہ زبانیں جانتے ہیں لیکن زبانوں کا جاننا الگ بات ہے اور تخلیقی زبانوں سے واقفیت الگ بات۔ کسی زبان کو جاننے کے لیے اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ محاورات اور قواعد کا عرفان کافی ہوتا ہے جبکہ تخلیقی زبان پر عبور حاصل کرنے کے اس زبان کو بولنے والوں کی پوری تہذیب و ثقافت کو اپنی تخلیقی ذات میں مدغم کرنا ضروری ہے۔ تمام تخلیقی زبانوں میں شاعری کی زبان ہی سب سے زیادہ

نازک، ذکی الحس اور لاجونتی زبان ہوا کرتی ہے۔آپ کے ذہن میں کسی اپنے شاعر (یا شاعرہ) کا نام ہو تو بتایئے جسے اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر کسی تین الگ الگ زبانوں میں شعر گوئی پر اس طرح عبور حاصل ہو کہ اس کی تخلیق اس مخصوص زبان کی عظیم شعری روایت سے مربوط و منسلک نظر آئے۔راقم الحروف کے ذہن میں ایک ایسا نام محفوظ ہے، وہ ہے محترمہ بیلیز بتھ کورین مونا کا۔مونا کی مادری زبان کیرلا کی زبان یعنی ملیالم ہے، لیکن انھیں اُردو ، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں کی شاعری پر یکساں قدرت حاصل ہے۔وہ جس زبان میں شاعری کرتی ہیں، اس زبان کی عظیم شعری روایت ان پر طاری ہوتی ہے۔اس وجہ سے ان کی شاعری گنگا، جمنا اور سرسوتی کا تری وینی سنگم نظر آتی ہے جہاں الگ الگ دھارائیں ایک دوسرے سے الگ طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔"

(کہکشاں۔ایلیز بتھ کورین مونا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2023 ص 7)

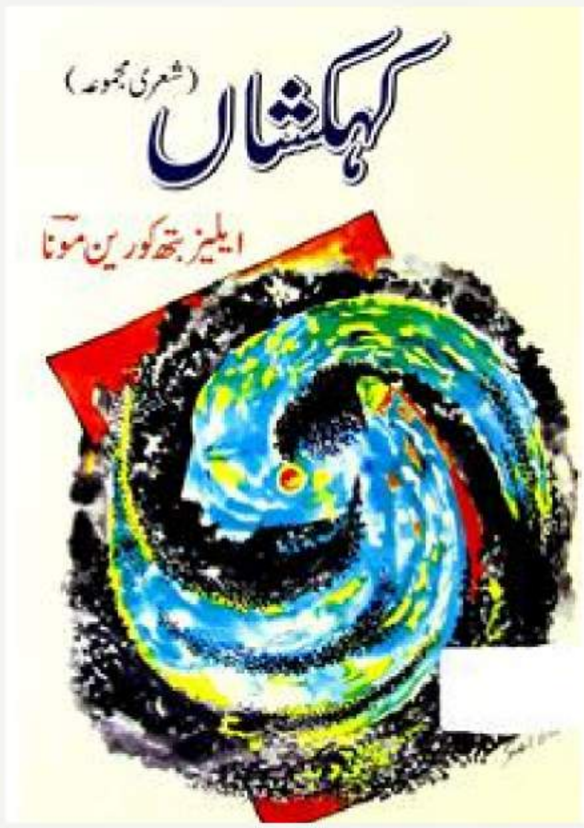

مونا کے والدین کیرالا سے آکر حیدرآباد میں قیام پزیر ہوئے۔مونا کی پیدائش حیدرآباد میں ہی ہوئی اور حیدرآبادی تہذیب کے زیر سایہ تعلیم و تربیت بھی ہوئی۔ حیدرآباد کے معروف مشن اسکول روزری کانونٹ میں انگلش میڈیم سے بنیادی تعلیم حاصل کی۔ نظام کالج سے بی۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی۔ بچپن سے ہی شاعری کا ذوق اُن کے ذہن ودل میں پنپنے لگا ہے۔ شاعری کی شروعات انگریزی شاعری سے ہوئی۔ پہلا ان کا کلام اسکول اور کالج کی میگزینوں میں شائع کیا جاتا تھا۔تعلیم سے فراغت کے بعد رزرو بینک آف انڈیا کی حیدرآباد علاقائی دفتر میں ملازمت کرنے لگیں۔

بینک میں ہندی دیوس کے موقع پر دفتر میں کوئی پرگرام ہوا کرتا تھا۔جس میں حیدرآباد کے ہندی اور اردو شعرا کو مدعو کیا جاتا تھا۔اس دوران مونا نے ہندی کویتا لکھنے کی شروعات کی۔حیدرآباد کی اردو اور ہندی انجمنیں جیسے "محفل خواتین گیت چاندنی اور ساہتیہ سنگم" میں شعر کہا کرتی رہیں۔آہستہ آہستہ ان کے اندر اردو شاعری کا ذوق پیدا ہوا ۔ بالآخر انھوں نے قلم اٹھالیا اور اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔جس کے نتیجے میں ان کا نام نہ صرف تلنگانہ ریاست حیدرآباد بلکہ ہندوستان کی معروف شاعرات کی فہرست میں شامل ہونے لگا۔جناب مصحف اقبال توصیفی لکھتے ہیں:

"ایلیز بتھ کورین مونا کی مادری زبان ملیالم ہے۔ایک ایسی زبان جس کا ثقافتی اور لسانی تشخص اُردو شاعری کی روایت سے یکسر مختلف ہے۔انہوں نے اسکول اور کالج کے دنوں میں بھی اُردو نہیں پڑھی۔اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ بہت عرصہ گزرنے کے بعد جب انہوں نے شعر گوئی اختیار کی تو اُردو شاعری کے مخصوص روایتی موضوعات کیسے یوں ان کے احساسات اور شعری اظہار کی پہچان بن گئے گویا وہ اُردو تہذیب کے گہوارے ہی میں پلی بڑھی ہوں۔اردو شاعری سے مونا کا لگاؤ ہندی فلموں کی دین ہے۔فلموں میں بھی اچھی شاعری ہوتی ہے آرزو لکھنوی سے لے کر جاں نثار، ساحر، شکیل، راجندر کرشن اور راجہ مہدی علی خاں تک، کئی شاعروں نے دل کو چھونے والے نغمے تحریر کیے ہیں۔جب مونا کو یہ پتہ چلا کہ یہ سب تو اُردو میں ہو رہا ہے تو وہ اس زبان پر اپنا دل ہار بیٹھیں۔اُردو غزلوں کے کیسٹ سنے اور پھر اُردو غزل اس طرح ان کی رفیق ہوگئی کہ دن بھر ان کے ساتھ رہتی، راتوں کو کبھی وہ اُسے سونے نہیں دیتیں اور خود اُسے نیند نہ آتی تو وہ مونا کو جگادیتی۔"

(کہکشاں۔ایلیز بتھ کورین مونا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص 7)

شروعات میں مونا کنول پرشاد کنول، حیدرآباد سے اردو غزل کے

بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ اردو سیکھنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ربط پیدا کیا اور فاصلاتی کورس بذریعہ خط و کتابت کے ذریعہ اردو رسم الخط سیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ انھوں نے اردو زبان پر مہارت حاصل کر لی۔ اسی دوران مونا کا تبادلہ حیدرآباد سے ممبئی ہو گیا۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک استاد اور شاعر آر پی شرما مہرش سے ملاقات ہوئی جن سے انھوں نے علم عروض کی تعلیم حاصل کی۔

قیام ممبئی کے دوران مونا ادبی نشست اور مشاعروں میں شرکت کرتی رہیں جہاں ان کا تعارف مقامی شعرا سے ہوا۔ جن میں قابل ذکر علی سردار جعفری، ندا فاضلی، ابراہیم اشک، ممتاز راشد اور مریم غزالہ وغیرہ شامل ہیں۔ ملازمت کے دوران انھیں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کرنے کا بھی موقع ملا جہاں ان کی ملاقات بشیر بدر، کرشن بہاری نور اور کرامت علی کرامت جیسے شعرا سے ہوئی اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔

چند سال بعد انھوں نے ملازمت کو خیر باد کہا اور ممبئی سے حیدرآباد آ گئیں۔ اردو شاعری اور زبان سے دلچسپی تھی تو انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے کورس تحسین غزل میں داخلہ لیا۔ حیدرآباد میں آکر انھیں اپنی تصنیفات، نثر میں مضامین اور شاعری کے مجموعے شائع کرنے کا وقت ملا۔ مختلف زبانوں میں لکھی گئیں پندرہ کتابیں شائع ہوئیں جن میں اردو کی پانچ کتابیں ہیں۔ جن کے نام کہکشاں، محبت کے سائے، ذوق جستجو، قوس قزح اور بادل کا سایہ (ملیالم سے اردو میں مختصر کہانیوں کا ترجمہ) ہیں۔
انگریزی میں ان کی کتاب The art and science of
A reader's guide to urdu ghazal,ghazal
Scansion and prosody,appreciation ہے۔ ان
کے انگریزی زبان میں شائع ہونے والے مجموعہ Beyond Image
کا ترجمہ فرنچ اور تامل زبان میں کیا گیا۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، تلنگانہ اور لکھنو سے اُن کی شائع شدہ کتابوں پر انہیں انعامات سے بھی نوازا گیا تھا، یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

مونا عصر حاضر کی ایک نمائندہ شاعرہ ہیں۔ وہ حالات حاضرہ سے متاثر ہو کر شعر کہتی ہیں۔ مونا کی شاعری میں ایک عجیب سا سرور ہے کیف کی دھیمی آنچ ہے۔ درد اور کرب کی خراشیں بھی ہیں۔ یاس اور امید کے جگنو بھی چمکتے ہوئے دکھ جاتے ہیں۔ فکر کی گہرائی بھی ہے اور معنی آفرینی کی وسعت بھی۔ اسلوب کی چاشنی بھی گاہ گاہ نظر آتی ہے۔ مونا کی شاعری یک رخی دو رخی یا سہ رخی نہیں ہے بلکہ اس کے بے شمار ڈائمنشنس ہیں۔ انھیں زندگی کا خاصا مشاہدہ ہے۔ جہاں تلخ تجربات سے وہ آشنا ہیں وہیں مسرت آمیز لمحات سے بھی حظ اٹھایا ہے۔ ان کی شاعری میں ہر طرح کے افکار و آگہی کے جگنو چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاعری کے لوازم سے وہ اچھی طرح باخبر ہیں۔ انداز بیان بڑا پیارا ہے۔ اسلوب میں بھی پختگی اور بیان میں بھی شائستگی موجود ہے۔ نکھرے نکھرے سے اشعار سامعین کے دلوں کو سرشار کرتے ہیں اور روح کو تازگی بھی عطا کرتے ہیں۔ جناب مصحف اقبال توصیفی لکھتے ہیں:

> "مونا نے کلاسیکی اُردو شاعری کے تقریباً سبھی موضوعات کو برتا ہے۔ غزل کے روایتی مضامین حسن و عشق، ہجر اور وصل کی کیفیات، شکایت زمانہ، تقدیر جبر بلکہ کہیں کہیں ذکر رقیب بھی دبے پاؤں ان کی شاعری میں در آیا ہے۔ قدیم غزلوں کی روایت میں مونا کی غزل کی جڑیں کتنی گہری ہیں اس مجموعے کی محض ورق گردانی سے ہمیں اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ محبوب کی بے اتفاقی، بے بات روٹھنا، جدائی کا غم اشکوں کا آب گم کے مانند، اندر ہی اندر سارے وجود کو بھگو دینا، یہ سارے دیدہ و نادیدہ مناظر مونا کی غزلوں میں دھنک کے رنگوں کی طرح بکھر گئے ہیں۔"

(کہکشاں۔ ایلیزبتھ کورین مونا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص18)

دراصل مونا خالص غزل کی شاعرہ ہیں۔ جنھوں نے اپنے فن کی اساس واردات قلبی کے اظہار پر رکھی ہے۔ ان کی شاعری سلامت زبان و بیان کے ساتھ شگفتگی، تازگی اور ندرت کا احساس دلاتی ہے۔ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے انھوں نے اپنی شاعری کو عصری آہنگ دینے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ بقول مصحف اقبال توصیفی اردو کی کلاسیکی شاعری کی روایات اور تتبع میں اچھے اشعار کی موجودگی کے ساتھ مونا کی غزلوں میں کچھ ایسے شعر بھی ملتے ہیں جو اپنے انوکھے طرز احساس کے سبب انفرادی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان کی غزلیں روایتی بھی ہیں اور ساتھ ہی ان میں جدیدیت بھی ہے۔ ان کی شاعری روایت اور جدیدیت کی درمیان ایک پل کی مصداق ہے۔ اس طرح ان کی شاعری تہذیبی رویوں سے گزرتے ہوئے عہد جدید کے زوال آمادہ معاشرے کے انسان سے ہم کلام ہوتی ہے۔ مونا خود یوں لکھتی ہیں:

> "مجھے بھی غزل کی صنف نے ہی اردو سیکھنے پر مجبور کیا اور غزل کہنے کی جستجو دل میں جگائی۔ پہلے انگریزی میں، پھر ہندی میں لکھتے لکھتے اردو میں بھی شاعری کر رہی ہوں۔ اس گلشن غزل

کی فضا میں مسرور ہوں۔ میرے استاد جناب کنول پرشاد کنول اور جناب آر۔ پی۔ شرما مہرشی" کی سرپرستی کے لیے میں ممنون ہوں جنھوں نے غزل کی راہ پر میری رہنمائی کی۔"

(ذوق جستجو۔ ایلیز بتھ کورین مونا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2016، ص 15)

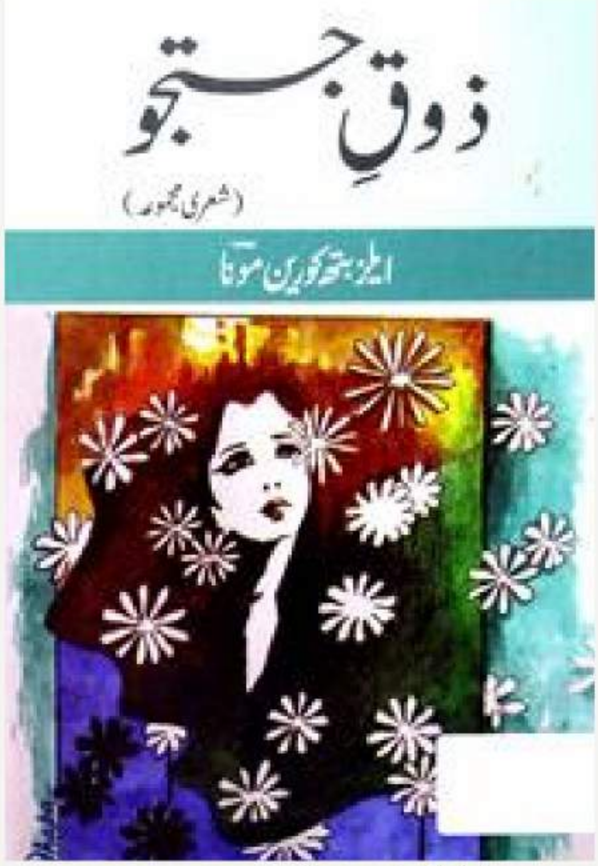

چند غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہے بہت
رات تاریک سہی ایک ستارا ہے بہت
(مطلع)

(ذوق جستجو۔ ایلیز بتھ کورین مونا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2016، ص 19)

ہونٹ خاموش تھے اک آہ بھی ہم بھر نہ سکے
بارہا دل نے مگر تم کو پکارا ہے بہت

جھوٹی تعریف سے لگتا ہے بہت ڈر مونا
میٹھی باتوں نے ہی شیشے میں اتارا ہے بہت
(مقطع)

دامن تیرا مجھ سے چھوٹا ملنے کے حالات نہیں (مطلع)
لیکن تجھ کو بھول سکوں میں ایسی بھی تو بات نہیں

خوش قسمت ہیں لوگ وہ جن کو پیار کے بدلے پیار ملا
اس دنیا میں ہر انساں کو حاصل یہ سوغات نہیں

جب جب تم یاد آئے مونا بھر آئیں میری آنکھیں
آگ لگائے دل میں آنسو یہ کوئی برسات نہیں
(مقطع)

(کہکشاں۔ ایلیز بتھ کورین مونا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص 57)

'محبت کے سائے' مونا کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت عام فہم اور سادگی ہے۔ وہ بہت سادہ الفاظ اور سادہ زبان کی مدد سے صرف اپنے فکر و خیالات کو پیش کرتی ہیں۔ گہرے موضوعات بھی انھوں نے سادہ انداز میں پیش کیے۔ اہل حیدرآباد میں روزمرہ میں استعمال کرنے والے دکنی الفاظ اور محاورہ وغیرہ اپنی نظموں میں بھی استعمال کیے ہیں۔ بہت کم الفاظ میں انھوں نے اپنے گہرے فکر و خیالات پیش کیے۔ اکثر نظمیں آزاد نظموں کی ہیت میں تحریر کی ہیں۔ مجموعہ 'محبت کے سائے' کے پیش لفظ میں جناب مضطر مجاز لکھتے ہیں:

"ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ عام طور پر ہمارے شعرائے کرام کچھ ایسے سہل نگار ہوتے ہیں کہ دو مصرعے موزوں کرنا بھی ابھی اچھی طرح نہیں آتا کہ ان میں کود پڑتے ہیں۔ پھر مشاعرے اور اردو رسالے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور پھر شاعری کی وہ ریل پیل شروع ہوتی ہے کہ الامان والحفیظ والحذر! مونا صاحبہ ان مکروہات سے دامن کشاں رہیں۔ وہ تو بس اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے میں مصروف ہیں۔ زیر نظر مجموعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ ان نظموں میں بحر و ردیف و قافیہ نہیں لیکن شاعری سے معمور ہیں۔"

(محبت کے سائے۔ ایلیز بتھ کورین مونا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014، ص 8)

آگے مزید یوں لکھتے ہیں:

"انھوں نے آزاد نظم کا فارم اختیار کیا جس میں بحر و ردیف و قافیہ کی جکڑ بندیاں نہیں ان کے جذبات و احساسات کا ابال ظرف تنگنائے غزل میں سمانہ سکتا تھا چنانچہ آزاد نظم کا یہ فارم ان کے بہت دل کو لگا اور زیر نظر نظمیں اس کا اظہار ہیں۔"

(محبت کے سائے۔ ایلیز بتھ کورین مونا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014، ص 9)

غزلوں کے بعد مونا نے نظموں کی طرف رخ کیا۔اس میں بھی انھوں اپنے جوہر دکھائے۔مونا خود لکھتی ہیں:

"غزلوں کی کوکشش نے مجھے اُردو ادب کی طرف کھینچا اور اُردو قارئین سے ملایا۔میری شاعری کو انھوں نے پسند کیا۔ میرا شعری مجموعہ کہکشاں" کو بھی ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ میری نظمیں بھی اُن تک پہنچیں۔ اس لیے میں اپنی منتخب نظموں کو ترجمہ کر کے اس کتاب میں پیش کر رہی ہوں۔ساتھ میں نیپال کے معروف مصور سشیل تھاپا کی بنائی تصویر میں بھی شامل ہیں جو نظموں کی روح تک پہنچتی ہیں۔"

(محبت کے سائے۔ایلیزبتھ کورین مونا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،2014،ص10)

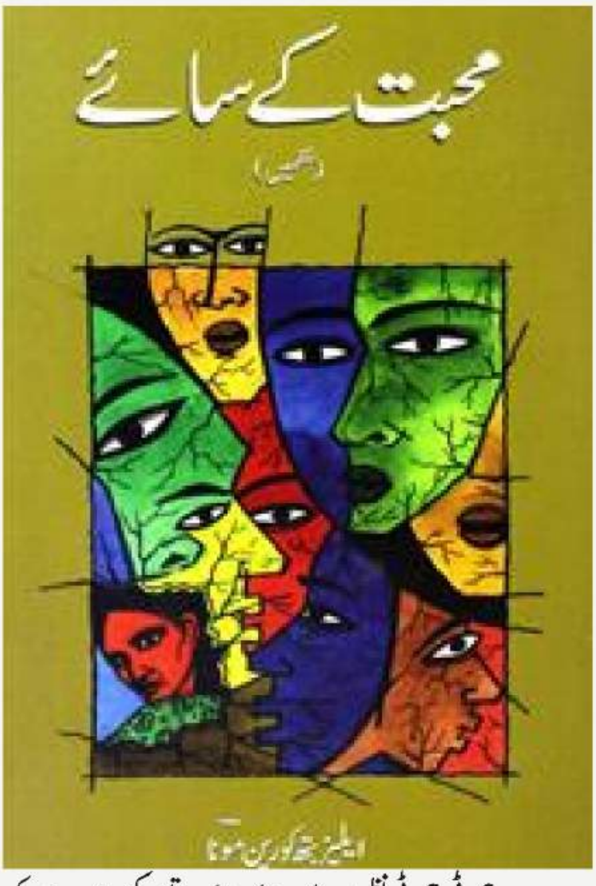

وہ چھوٹی چھوٹی نظموں میں بڑی بڑی باتیں کہی ہیں۔ان کی شاعری میں لطافت کے رنگ ملتے ہیں۔ماضی، خواہشات، آسمانی، پری، راہیں، خواب، شبنم اور گلاب، ملاقات، عبادت، عورت، غربت، سکون، پھیرے، پیالہ زندگی کا، دعوت، سہارے، سنگم، یاد، عمر قید، کشمکش، لاشیں، کردار، پڑوسی، خاموش رات، تضاد، نشہ، حفاظت، آواز اور خاموشی وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہیں:

لاش کو دفنانا آسان کام نہیں ہے (نظم:لاشیں)
مرنے والے کے احباب کو لگتا ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے
اور کسی بھی وقت اٹھ کر انہیں گلے لگا سکتا ہے
یہی سوچ کر وہ اس لاش کے دامن کو چھوڑنا نہیں چاہتے
کوئی معجزہ ہونے پر ہی لاش میں جان آ سکتی ہے
چاہے وہ موت انسان کی ہو یا کسی رشتے کی

(محبت کے سائے۔ایلیزبتھ کورین مونا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،2014،ص51)

زندگی کے ناٹک میں، ایک اداکارہ ہوں میں (نظم: کردار)
یہ ہوگا المیہ یا رزمیہ، کون بتا سکتا ہے
جب پردہ اٹھتا ہے، مجھے اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے
کچھ سوچے سمجھے بغیر، دوسرے اداکاروں کے اشاروں پر
بولنے پڑتے ہیں اپنے مکالمے، میرے کردار ہیں بے شمار
مختلف جذبات لیے، مدد کرنے کے لیے مجھے
پس پردہ کوئی نہیں ہے، کیا میں نے اپنا کردار صحیح نبھایا
جو کہنا تھا سہی کہا سہی ڈھنگ سے، کیا میں ناکامیاب تھی
کیا سامعین کی تالیاں، اور نقادوں کی داد میں نے حاصل کی
یا پھر سب کی نظروں میں گر گئی، ان سوالات کا وقت ہی جواب دے گا
پردہ گرنے کے بعد

(محبت کے سائے۔ایلیزبتھ کورین مونا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،2014،ص51)

الغرض مونا ملیالی اردو محبان کی آبرو صرف نہیں بلکہ دنیا کے پورے محبانِ اردو کی آبرو ہے۔ان کی شاعری آج کالی کٹ یونیورسٹی کے ایم۔اے نصاب میں بھی شامل کی گئی ہے۔ان کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

Arif N
Research Scholar,Dept.of Urdu
Sree Sankaracharya University of Sanskrit,
Regional Campus Koyilandi
Naduvathur P.O.
Koyilandy, Kozhikode-673330,(Kerala)
arifn651gmail.com
+918089810461

بیگم سلطان جہاں

ایک خاتون، ایک تحریک

محمد ارشاد

علی گڑھ تحریک کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ سرسید کے زمانے میں ہی بہت سی خواتین نے اس کی حمایت کی اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے عملی اقدامات اٹھائے۔ انھیں خواتین میں بیگمات بھوپال کا شمار ہوتا ہے۔ بیگمات بھوپال میں بیگم سلطان جہاں کا نام خواتین کی تعلیم کے باب میں خاصا اہمیت کا حامل ہے۔ جس طرح ان کی والدہ شاہ جہاں بیگم اور نانی سکندر جہاں بیگم کو سرسید کے خیر خواہوں میں گنا جاتا ہے اسی طرح سلطان جہاں بیگم کو سرسید کے شاگرد رشید شیخ عبداللہ کے کرم فرماؤں میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ کہنے میں کیا غلو ہوسکتا ہے کہ اگر شیخ عبداللہ کی تحریک نسواں کے بالکل ابتدائی دنوں میں بیگم سلطان جہاں کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو ان کی تحریک کو کامیاب ہونے میں تھوڑا وقت اور لگ سکتا تھا۔ بیگم سلطان جہاں بھوپال کی تیرہویں حاکم اور تیسری خاتون حکمراں تھیں۔ انھوں نے تقریباً پچیس سال ریاست بھوپال پر حکمرانی کی۔

اس طویل مدت میں ریاست کی ہمہ جہت ترقی ان کے مرکز نگاہ رہی۔ نہ صرف خواتین کی تعلیم ان کی دلچسپی کا موضوع تھا بلکہ انھوں نے قانون، صحت، روزگار، طبقاتی برابری غرض سماجی اصلاح کی ہر سمت پر یکساں توجہ دی۔ جہاں انھوں نے عملی طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اسکول قائم کیے، لاوارث خواتین کے معاشی استحکام کے لیے ٹریننگ سنٹر کا افتتاح کیا، ریاست میں امن و امان کے قیام کو یقینی بنانے کے لیے نئے قوانین وضع

کیےاور پرانے میں مناسب تبدیلیاں کیں اور لیڈیز کلب کی بنیاد ڈالی وہیں دوسری طرف انھوں نے فکری طور پر بھی سماج کو استحکام بخشا اور تمام تر مصروفیات کے باوجود مختلف موضوعات پر چالیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں گوہر اقبال، ہدایات سلطانی، تندرستی، حفظان صحت، سیرت مصطفیٰ، معیشت، خانہ داری، پردہ، تہذیب نسواں وغیرہ اہم ہیں۔کئی رسالوں کی سربراہی کی اور ان کی اشاعت کے سلسلے میں مسلسل امداد دیتی رہیں۔ انھیں کی خواہش پر محمد امین زبیری جو اس وقت ان کے لٹریری اسسٹنٹ تھے، نے جون 1913 میں ’ظلّ السلطانی‘ کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔اس کے علاوہ سید محمد یوسف قیصر المعروف بہ قیصر بھوپالی نے ’’جون 1909 میں عورتوں کے لیے ایک ماہانہ رسالہ ’الحجاب‘ کے نام سے جاری کیا۔ اس کی سرپرست نواب سلطان جہاں بیگم تھیں، جن کا نام رسالے کی پیشانی پر لکھا جاتا تھا۔‘‘ (خطوطِ شبلی: بنام خواتین فیضی، مولف: محمد امین زبیری، مرتب و مدون: ڈاکٹر شمس بدایونی، ناشر: اپلائڈ بکس، دہلی، 2020، ص16) اپنی انہی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے 1920 میں جب علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو بیگم سلطان جہاں اس کی پہلی چانسلر مقرر ہوئیں اور حین حیات اس عہدے پر وقار کے ساتھ فائز رہیں۔

سلطان جہاں کی پیدائش 9/ جولائی 1858 میں غدر کے ایک سال بعد ہوئی۔ ظاہر ہے جب انھوں نے سن شعور کو قدم رکھا تو اس وقت ملک میں انگریزوں کا طوطی بول رہا تھا۔ سلطان جہاں نے بالغ سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں سے مفاہمت جاری رکھی اور اپنی ریاست کو ترقی کی نئی منزلوں تک پہنچایا۔ ان کی طبیعت انتہائی متین اور سنجیدہ تھی۔ ان کی متانت اور سنجیدگی کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی پانچ اولادوں میں سے چار نے ان کی حیات میں ہی وفات پائی۔ تاہم ان صدمات نے ان کی حاکمانہ صلاحیتوں کو کسی طور بھی متاثر نہ کیا۔ شاہی خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے عمر کے بالکل ابتدائی زمانے سے ہی سلطان جہاں بیگم کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی۔ ان کی پیدائش پر ان کی نانی سکندر جہاں بیگم نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ’’یہ بچی مجھے سات بیٹوں سے زیادہ عزیز ہے‘‘۔ (بحوالہ بیگم سلطان جہاں از سیما صغیر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 2016، ص5) چار سال کی عمر تک سکندر جہاں بیگم نے بڑی محبت و شفقت کے ساتھ ان کی پرورش و تربیت کی، مجلسی آداب سکھائے، تعلیم کے ساتھ کھیل کود کی بھی ترغیب دی۔ سلطان جہاں کی یہ خوش بختی تھی کہ ان پر گھر کے باقی افراد خصوصاً والدین نے بھی بہت توجہ دی۔ ان کے والد باقی محمد خاں اپنی بچی کو نہ صرف عزیز رکھتے تھے بلکہ اس کی ہر ضرورت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ یہ ابتدائی تعلیم کا ہی فیض تھا کہ سلطان جہاں اردو، فارسی اور انگریزی میں بھی دسترس رکھتی تھیں۔ وہ نہ صرف ایک اچھی مقرر، مصنف، شہ سوار، تیر انداز تھیں بلکہ طریق حکومت سے بھی کما حقہ واقف تھیں۔ انھوں نے چالیس سے زیادہ کتابیں اردو زبان میں تحریر کیں۔ مجموعی طور پر ان کا دور حکومت ایک آئیڈیل حکومت تھا۔ انھوں نے 9/ جون 1926 کو امور سلطنت اپنے فرزند نواب حمید اللہ خاں کے حوالے کیا اور چار برس بعد 12/ مئی 1930 کو دائی اجل کو لبیک کہا۔

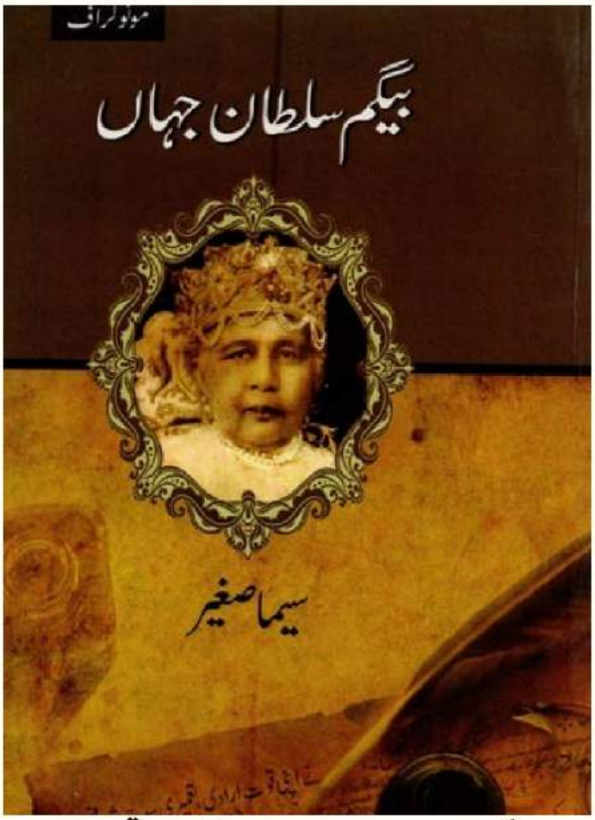

بیگم سلطان جہاں متعدد صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ کیا امور سلطنت اور کیا سماجی اصلاح، کیا خواتین کی تعلیم و تربیت اور کیا حکومت کی اندرونی چپقلشوں کا انسداد، انھوں نے ہر ایک مسئلے پر اپنی عقل فہمی اور سیاسی دور اندیشی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے ایک طرف فکری سطح پر رعایا کی تربیت کی غرض سے متعدد کتابیں اور مضامین لکھے۔ دوسری طرف اپنی ریاست میں علم کے فروغ کے لیے کئی وظیفے جاری کیے اور ملک بھر سے مختلف طرح کی امداد کے تقاضوں کو بھی پورا کیا۔ علی گڑھ تحریک سے قبل پورے ملک میں تعلیمی صورت حال ابتر اور تقریباً یکساں تھی۔ تحریک کی بدولت ان حالات میں تھوڑی بہت تبدیلی برپا ہوئی۔ بھوپال میں بھی تعلیمی

صورت حال بہت حوصلہ افزا نہیں تھی۔ سلطان جہاں نے خود فرمایا ہے کہ ان کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں حالات کس قدر مایوس کن تھے۔

''صیغۂ تعلیم پر بھی میری نظر تھی اور جس طرح کہ ریاست کی مالی مشکلات مجھے پریشان کررہی تھیں اسی طرح رعایا کی وہ غفلت جو تعلیم سے تھی، پریشان کیے ہوئے تھی۔''

(حیات سلطانی مرتبہ محمد امین زبیری، مطبوعہ: عزیزی پریس آگرہ، 1939، ص64)

بیگم صاحب کے نزدیک عورتوں کی تعلیم بھی اسی قدر ضروری تھی جس قدر مردوں کی۔ وہ زندگی کو ایک گاڑی سے تشبیہ دیتی ہیں۔ ''سلک شہوار'' میں شامل پہلی تقریر جو انھوں نے برجیسیہ کنیہ پاٹھ شالا کے افتتاح کے موقع پر کی تھی اس میں فرماتی ہیں کہ ''میں عورتوں کی تعلیم کو بھی ایسا ہی ضروری سمجھتی ہوں جیسا کہ مردوں کی تعلیم کو۔ دنیا کی زندگی ایک گاڑی کی مانند ہے جس کا ایک پہیہ مرد ہے اور دوسرا عورت۔ ایک پہیہ صاف ہو اور تیز چلتا ہو اور دوسرا پہیہ زنگ آلود تو زندگی کی گاڑی اچھی طرح نہیں چل سکتی۔ پس کامیابی اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ مرد اور عورت دونوں تعلیم یافتہ ہوں۔'' (سلک شہوار از بیگم سلطان جہاں، مدون: مسز جی بخش، مطبع: انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، 1919، ص1) بیگم سلطان جہاں کو اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ ہندوستانی معاشرہ خواتین کی تعلیم کے باب میں متعصب ہے۔ انھوں نے اس جانب توجہ دیتے ہوئے نہ صرف تعلیم نسواں کی مختلف تحریکات کے لیے مالی امداد فراہم کی بلکہ قلم کے ذریعہ رائے عامہ کو ہموار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ عملی اقدام کے ذیل میں انھوں نے کئی اہم کارنامے انجام دیے۔ لڑکیوں کے لیے ''آصفیہ ٹکنیکل اسکول'' قائم کیا۔ خاندان کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے محل کے اندر ہی اپنی نانی کی یاد میں ''مدرسۂ سکندریہ'' قائم کیا۔ ہندو لڑکیوں کی تعلیم کی خاطر ''برجیسیہ کنیہ پاٹھ شالا'' قائم کیا۔ یوں تو بیگم صاحب کی نظر میں ان کی رعایا بغیر کسی مذہبی شناخت کے برابر تھی تاہم انھوں نے ہندو لڑکیوں کی علاحدہ تعلیم کے متعلق فرمایا تھا کہ

''حاضرین میں اپنی رعایا کو بلا تمیز فرقہ وملت کے بہت عزیز رکھتی ہوں اور اس کی بہبودی اور سرسبزی کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ ہندو اور مسلمان مثل میرے دائیں اور بائیں آنکھ کے ہیں اور تم جانتی ہو کہ کوئی شخص پسند نہیں کرے گا کہ اس کی ایک آنکھ کی روشنی زیادہ ہو اور دوسرے کی کم...''۔

(سلک شہوار از بیگم سلطان جہاں، مدون: مسز جی بخش، مطبع: انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، 1919، ص2،3)

بیگم سلطان جہاں نے کئی ایک مدرسے اپنی ذاتی دلچسپی سے قائم کیے جہاں لڑکیوں کو استانی کی ڈگری دی جاتی تھی۔ ان مدرسوں میں سے ایک مدرسہ سلطانیہ تھا۔ اس کی یہ خوبی تھی کہ یہاں معمولی اور اوسط پڑھی لکھی خواتین کو بطور استانی تیار کیا جاتا تھا۔ اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والی خواتین کے لیے وظائف کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں، منظور شدہ نصاب کے علاوہ قرآن مجید اور دست کاری کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ ساتھ ہی فرسٹ ایڈ اور ایمبولنس کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ بیگم صاحب نے اس مدرسے میں ایک بورڈنگ ہاؤس بھی قائم کیا تھا۔ سلطان جہاں بیگم کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ خواتین کے لیے معلّمی کا پیشہ مناسب ترین پیشہ ہے۔ اس میں اول تو لوگوں کی اصلاح کا موقع ملتا ہے جو بذات خود ایک مستحسن عمل ہے۔ دوم خواتین کے لیے مشاہدے کی بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ معلّمی محفوظ ترین پیشہ بھی ہے۔ بیگم صاحبہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ ''خواتین! تمام پیشوں میں جو عورتیں اور مرد کرتے ہیں معلّمی کا پیشہ سب سے زیادہ شریف اور اعلیٰ ہے کیوں کہ اس میں انسانوں کو بہت سے انسانوں کی سیرت اور عادات و اخلاق اور آئندہ زندگی درست کرنے کا موقع ملتا ہے۔'' (سلک شہوار از بیگم سلطان جہاں، مدون: مسز جی بخش، مطبع: انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج 1919، ص153)

اس مدرسے میں تعلیم کے ذرائع کی صورت حال دیکھ کر 1911 میں معائنے کے بعد لیڈی اُڈوائر نے تحریر کیا تھا کہ

''اس مدرسے میں ہر ہائینس کی گہری دل چسپی امرائے ریاست کے آئندہ نونہالوں کے لیے تعلیم یافتہ اور تمیز دار بیویاں مہیا کرنے میں بہت مفید ہوگی اور اس اسکول کے افتتاح میں ...وغیرہ کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہوں کیوں کہ یہ اپنی قوم کی ہمدردی کا ایک ثبوت ہوتا ہے اور اس سے دوسروں کے حوصلے بڑھتے ہیں۔''

(بحوالہ بیگم سلطان جہاں از سیما صغیر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 2016، ص28)

بیگم سلطان جہاں کی اکثر تحریروں میں اس امر پر خاص توجہ صرف کی جاتی ہے کہ خواتین دین و دنیا میں ترقی کے یکساں منازل طے کریں۔ بیگم صاحب نے عورتوں کے لیے اخروی کامیابی کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں خواتین کو بارہا یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے لیے صحابیہؓ کی ذات بابرکات کو اسوہ بنائیں۔ انھوں نے قرون اولیٰ کی خواتین کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ آج کی خواتین کو ان پاک صفت بیویوں سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے کہ کس طرح صحابیات

میدان جنگ میں مردوں کے شانہ بہ شانہ حصہ لیتی تھیں، ان کے حوصلے بڑھاتی تھیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، انھیں پانی پلاتیں اوران کے کھانے کا انتظام کرتی تھیں۔بیگم صاحب نے موجودہ خواتین کے لیے رول ماڈل کے طور پر صحابیات کو ہی پیش کیا ہے۔ان کا اس حقیقت پر ایقان تھا کہ سماج کی حقیقی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی بھی ہمہ جہت ترقی ہو۔یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ بیگم صاحب خواتین کو ہر طرح کی آزادی کا مشورہ تو دیتی ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ آزادی غیر مشروط نہیں ہونی چاہیے یعنی یہ آزادی شرم، حیا اور اسلام کے بنیادی اخلاقی تقاضے کی پابند ہونی چاہیے۔انھیں اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ خواتین کو دینی تعلیم دینے کے لیے کسی مدرسے کا ہونا ضروری ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بھوپال کے تمام مدارس میں بنیادی مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا اور زنانہ مدرسوں میں قرآن بالترجمہ نصاب میں داخل کیا۔یہ ایک مستحسن قدم تھا لیکن اس کا دائرہ بہت وسیع نہ ہوسکا۔چوں کہ خواتین کی مذہبی تعلیم کا معاملہ بیگم صاحب کے نزدیک ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا تھا اسی لیے انھوں نے خاص طور پر مذہبی تعلیم کے لیے 5/مئی 1927 کو ایک زنانہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔اس مدرسے کی بنیاد کے وقت دقت یہ پیش آئی کہ تلاش بسیار کے بعد بھی ایسی استانیاں نہ مل سکیں جو عوتوں کو پڑھا سکیں اور نہ ہی ایسی کتابیں مل سکیں جن سے نصابی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔تاہم انھوں نے وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دستیاب شدہ کتابوں کے بھروسے ہی عورتوں کے لیے مدرسہ حمیدیہ اسلامیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جہاں خواتین کی تعلیم کا انتظام مذہبی معاملات کو سامنے رکھ کر کیا گیا۔مدرسے کی بنیاد کے موقع پر ایک عظیم الشان جلسے کا بھی اہتمام کیا گیا۔حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے بیگم صاحب نے جو تقریر کی اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''اب سے چوتھائی صدی پہلے عوتوں میں یک گونہ مذہبی پابندی موجود تھی اگرچہ ان میں ضعیف الاعتقادی بھی تھی تاہم وہ روزے نماز وغیرہ کی پابند تھیں مگر اب اس میں روز بہ روز کمی ہورہی ہے اور یہ خطرہ صاف نظر آرہا ہے کہ آئندہ نسل میں برائے نام بھی مذہب کی حرمت باقی نہ رہے گی۔...جب مسلمانوں کا دور تنزل شروع ہوا اور وہ اپنے محاسن سے عاری ہوچلے تو انھوں نے اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تو مسلمان عورتوں کے مرتبہ اور وقار میں بھی فرق آنا شروع ہوا اور علم کا دروازہ بھی ان پر بند کیا جانے لگا یہاں تک کہ یہ نصف حصہ قوم علم سے محروم ہوگیا۔''

(بحوالہ بیگم سلطان جہاں از سیما صغیر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 2016،ص30،31)

بیگم بھوپال خواتین کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔انھوں نے ایک طرف طبقۂ نسواں کی مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا تاکہ وہ دنیوی اور اُخری دونوں جہانوں میں کامیاب رہیں تو دوسری طرف اس طبقے کو معاشی طور پر مستحکم کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ان کا ماننا تھا کہ اگر خواتین خودکفیل ہوں گی اور معاشی طور پر مضبوط رہیں گی تو اس سے نہ صرف ان کی بھلائی ہوگی بلکہ وہ ریاست پر بھی بوجھ نہ بنیں گی۔محمد امین زبیری نے اس امر کی طرف بارہا اشارہ کیا ہے کہ پورے ہندوستان کی طرح بھوپال میں بھی بے ہنر اور مجبور عورتوں کی کمی نہ تھی لیکن یہاں ان پر وہ صعوبتیں نہ تھیں جو دیگر جگہوں کی خواتین کو برداشت کرنا پڑتی تھیں۔اس کی وجہ انھوں نے زنانہ حکومت کی فیاضی قرار دیا ہے۔بیگم سلطان جہاں کا یہ بھی ماننا تھا کہ جو عورتیں اپنی کفالت کے لیے مکمل طور پر مردوں پر منحصر ہوتی ہیں، مردوں کے انتقال کے بعد انھیں زیادہ دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بالآخر انھیں یا تو غیر قانونی کام کرنے پڑتے ہیں اور جرائم پیشہ ہونا پڑتا ہے یا فاقہ کشی پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔بیگم بھوپال ایسی ہی عورتوں کے متعلق فرماتی ہیں کہ ان عورتوں نے ایک طرح سے خود کو اپاہج اور نکما بنالیا ہوتا ہے جن کا سارا بار براہ راست سرکاری خزانہ پر آتا ہے۔اسی لیے بیگم صاحب نے ''بھوپال کی ایسی عورتوں کے لیے ایک ایسا مدرسہ جس میں ضروریات روزمرہ میں کام آنے والی چیزوں کی صنعتی تعلیم دی جائے قائم کرنا تجویز کیا تاکہ اس میں صنعت وحرفت سیکھ کر کچھ نہ کچھ اپنی مدد کرسکیں۔'' (بحوالہ بیگم سلطان جہاں از سیما صغیر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 2016،ص33) کچھ عرصے بعد اس اسکول میں جدید اسکیم کے تحت نئے علوم کو شامل کیا گیا۔نقاشی، مصوری، چمڑے کے کام، صابن وعطر سازی وغیرہ جیسے منصوبے بنائے اور نافذ کیے گئے۔سائنٹفک طریقے سے اچار، مٹھائی اور چٹنی بنانے کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا۔مختلف مدارس کی طالبات کے لیے کئی طرح کے کورسس کا اہتمام کیا گیا جن میں حفظان صحت ، بچوں کی خبر گیری، خانگی تیمارداری، گرل گائیڈ شامل کیے گئے اور ایمبولنس کا اضافہ بھی کیا گیا۔اس طرح کی کوششیں اس بات کی مظہر ہیں کہ بیگم صاحب ایک دوررس حاکم تھیں جنھوں نے اپنی رعایا بالخصوص خواتین کی ترقی پر اس وقت زور دیا جب ان کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔بیگم سلطان جہاں کی کوششوں سے اہل بھوپال کے شعور کو بلوغت ملی

اور تعلیم و تربیت نے ان کے دل و دماغ کے بند دروازوں کو کھولا۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں کے بانی شیخ عبداللہ اپنے رسالے ''خاتون'' کے اکثر شماروں میں بیگم سلطان جہاں کے متعلق دعا گو ہوتے ہیں کہ

> ''اللہ تعالی ہر ہائینس بیگم صاحبہ جیسی روشن دل اور مہربان حکمراں کے اقبال اور عمر کو بڑھائے اور عرصۂ دراز تک وہ اپنی خوش قسمت رعایا کے سر پر سایہ فگن رہیں۔''

(بحوالہ بیگم سلطان جہاں از سیما صغیر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2016، ص35)

بیگم سلطان جہاں نے نہ صرف اپنی ریاست میں تعلیمی تحریک کی شروعات کی بلکہ ملک کے دیگر حصوں میں بھی ہونے والی تحریکات کو اپنا دست تعاون بڑھایا۔ اگر علی گڑھ تحریک کے حوالے سے بات کریں تو اس تحریک کے ایک سپاہی شیخ عبداللہ کی جس طرح بیگم سلطان جہاں نے مدد کی۔ ایسی مدد شیخ صاحب کی کسی اور فرماں روا نے نہ کی۔ لڑکیوں کے اسکول کے قیام کے سلسلے میں شیخ عبداللہ کو عطیہ دینے والی سب سے پہلی شخصیت بیگم صاحب کی ہی تھی۔ شیخ عبداللہ، بیگم صاحب کی علمی فیاضی سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے امداد کے سلسلے میں جو درخواست ان سے کی اس میں بیگم صاحب کے متعلق لکھا کہ ''اس زمانے میں آپ کل دنیا کی عورتوں میں تنہا ایک ریاست کی حکمراں ہیں اور کوئی دوسری عورت اس وقت اس قدر اعلیٰ مرتبے کی مالک دکھائی نہیں دے رہی ہے جیسی کہ آپ ہیں۔ اگر آپ کے زمانے میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ ہوئی تو پھر ان کی کبھی بھی پرسش نہیں ہوگی۔'' (مشاہدات و تاثرات از شیخ عبداللہ، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دہلی 2015، ص312) ان کی اس اپیل پر بیگم صاحب ہی نے سب سے پہلے 1904 میں ایک ایسے اسکول کے لیے سو روپے ماہانہ کی ایانت کا فیصلہ کیا جس کا قیام ہنوز باقی تھا۔ بیگم صاحب نے ایسے وقت میں اس امداد کا اعلان کیا جب شیخ صاحب ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں شامل ہونے کے لیے لکھنؤ روانہ ہونے والے تھے اور وہاں لڑکیوں کے اسکول کی تجویز رکھنے والے تھے۔ یہی وہ ابتدائی امداد تھی جس کے بوتے شیخ عبداللہ نے علی گڑھ میں لڑکیوں کے لیے ایک اسکول کا آغاز کیا۔ پروفیسر گیل مینو اس سلسلے میں فرماتی ہیں کہ:

> ''ان (بیگم سلطان جہاں) کے سامنے شیخ عبداللہ نے (اس طرح کی تحریک کی مخالفت کے باوجود) علی گڑھ میں ایک پرائمری اسکول کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیخ عبداللہ نے بیگم بھوپال سے عرض کیا کہ آپ کے اخلاقی اور مالی تعاون کے نتیجے میں اس کی مخالفت کافی حد تک ختم ہو جائے گی... بیگم بھوپال کو یہ خیال پسند آیا اور انھوں نے علی گڑھ گرلس اسکول کے لیے سو روپے ماہانہ امداد کا وعدہ کیا۔''

(بیویوں کے مدرسے از پروفیسر گیل مینو، مشمولہ علی گڑھ میگزین، خواتین نمبر 2001، ص63)

بیگم سلطان جہاں کی امداد نے شیخ صاحب کے حوصلے بڑھائے اور انھوں نے اسی وقت ارادہ کرلیا کہ لڑکیوں کا اسکول علی گڑھ میں ضرور قائم ہوگا۔ اس پہلی عنایت کے بعد ابر سلطانی سرزمین علی گڑھ پر مسلسل برستا رہا۔ جب بھی علی گڑھ میں خواتین کی تعلیم میں کسی طرح کی رکاوٹ محسوس ہوئی شیخ عبداللہ نے بیگم بھوپال سے رجوع کیا اور دامن مراد کو بھر کر لوٹے۔ 1907 میں بیگم صاحبہ نے گرلز اسکول میں کمروں کی تعمیر کے لیے پندرہ ہزار روپئے نقد اور ڈھائی سو روپئے ماہوار کی امداد منظور کی۔ 1913 میں جب شیخ صاحب نے لڑکیوں کے لیے رہائش گاہ کی تعمیر کا کام شروع کیا تو عمارات کی شان و شوکت اور طمطراق اور ان پر کیے گئے صرفہ کو دیکھتے ہوئے انگریزی حکومت نے باقی اخراجات کا صرف نصف حصہ ہی دینا منظور کیا۔ شیخ عبداللہ کے سامنے یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ اگر مطلوبہ رقم نہ ملی تو یہ سارا کام اور لڑکیوں کی تعلیم کا یہ مشن شاید سرد خانے میں چلا جائے گا ایسے آڑے وقت میں بیگم بھوپال نے ہی تعمیر کی بقیہ رقم بیس ہزار روپئے اپنی طرف سے عنایت کیے۔

بیگم سلطان جہاں کے سامنے خواتین کی جدید تعلیم کا معاملہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ جدید تعلیم اپنے صحیح تر مفہوم کے ساتھ خواتین میں اس وقت تک سرایت نہیں کرسکتی جب تک کہ مروجہ فرسودہ تعلیمی نصاب کو بدل کر ایک جدید اور کارآمد نصاب نہ تیار کرلیا جائے۔ بیگم صاحب کے نزدیک مروجہ نصاب خواتین میں وہ خوبیاں اور لیاقتیں پیدا نہیں کرسکتا جن کا تقاضا جدید دور کررہا ہے۔ لہٰذا انھوں نے مسلم خواتین کے لیے الگ نصاب بنانے کی غرض سے علی گڑھ میں پانچ ہزار روپئے کی مالی امداد بھی فراہم کی اور جب نئے نصاب کے مطابق کتابیں ان کے سامنے پیش کی گئیں تو ان پر عمدہ تبصرہ بھی کیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بیگم سلطان جہاں نے ہر اس کام کی طرف توجہ دی جسے عورتوں کے لیے بالعموم شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا۔

□□□

Mohammad Irshad
Research Scholar
Dept. of Urdu
University of Calcutta
Kolkata-700073 (W.B)
Mob: 8296069173

نغمہ تبسم

بنگال کی اولین خاتون افسانہ نگار
راحت آرا بیگم

راحت آرا بیگم کا شمار بنگال کی اولین خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش1910 میں کلکتہ کے ایک معزز خاندان میں ہوئی۔ معزز اس لیے کہ وہ جس گھرانے میں پیدا ہوئیں اس میں بیشتر لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور کسی نہ کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے گھر کا ماحول بھی بہت خوش گوار اور خوش نما تھا۔ راحت آرا بیگم کے والد شمس العلما کمال الدین احمد لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے، جو اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے لیے بہت مشہور تھے۔ ان کی والدہ عفت آرا بیگم بھی ایک پڑھی لکھی اور مہذب خاتون تھیں۔ راحت آرا بیگم کے دادا ذوالفقار علی مشہور و معروف عالم اور بہترین سیاسی لیڈر تھے۔ ان کے نانا نواب بہادر عبداللطیف بھی ایک عمدہ شاعر تھے۔ اس کے علاوہ ان کے بیشتر رشتے دار بھی معززین یعنی سرکاری افسران تھے۔ پروفیسر اقبال عظیم راحت آرا بیگم کے خاندانی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی تصنیف ''مشرقی بنگال میں اردو'' میں لکھتے ہیں:

''نواب بہادر عبداللطیف جن کا مفصل ذکر اسی تذکرہ میں کئی بار آچکا ہے، راحت آرا بیگم کے نانا تھے اور اس رشتہ سے عبدالغفور نساخ بھی ان کے نانا ہوتے ہیں۔ علامہ رضا علی وحشت کے استاد شمس کلکتوی ان کی والدہ کے سگے چچا زاد بھائی تھے۔ اسی طرح ان کی قرابت داری نہ معلوم کتنے مشاہیر بنگال سے اور ہے۔ چنانچہ نواب سید آزاد مرحوم ان کے سگے خالو، ڈاکٹر سید حسین صاحب ان کے خالہ زاد بھائی اور بیگم عائشہ اکرام اللہ ان کی بھانجی ہیں، صابق وزیر اعظم بنگالہ جناب اے۔ کے۔ فضل حق جواب مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ ہیں اور سابق وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کرنل سر حسان سہروردی ان کی خالہ زاد بہنوں کے شوہر تھے۔ مشہو افسانہ نگار جمیلہ بیگم ان کے پھوپھی زاد بھائی کی بیوی ہیں۔ ان خاندانی تعلقات کے علاوہ راحت آرا بیگم کے ماموں نواب زادہ ابوالفتح محمد عبدالحفیظ اور نواب زادہ ابوالفیض محمد عبدالعلی فیض بھی معروف شخصیتیں تھیں۔''

(سید اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، مشرق کوآپریٹیو پبلی کیشنز، ڈھاکہ، 1954، ص۔117-118)

درج بالا اقتباس میں مذکوران اہم شخصیات کا اثر راحت آرا بیگم کی زندگی پر بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ضرور پڑا ہے نیز ان کی تعلیم و تربیت اور

تخلیقات پر بھی ان شخصیات کا گہرا اثر رہا ہے، جن کی بدولت ہی راحت آرا بیگم بہترین افسانے تخلیق کر سکیں اور ادبی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر سکیں۔

راحت آرا بیگم کی ابتدائی تعلیم کلکتہ کے مشہور اسکول ''سخاوت میموریل گرلس اسکول'' میں ہوئی۔اس کے بعد کی تعلیم انھوں نے 1920 سے لے کر 1924 تک لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ کیوں کہ اس زمانے میں ان کے والد شمس العلما کمال الدین لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔لکھنؤ میں چار سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ کلکتہ واپس آگئیں اور یہیں سے اپنی تعلیم مکمل کی۔

راحت آرا بیگم کی شادی خان بہادر محمد سراج الاسلام سے ہوئی، جو چٹا گانگ کے بہت ہی معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔خان بہادر محمد سراج الاسلام نے بنگال سول سروس کے رکن کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں، جن کو کافی سراہا گیا تھا۔ان سے شادی کرنے کے بعد راحت آرا بیگم کلکتہ اور چٹا گانگ میں رہیں۔راحت آرا اور سراج الاسلام کی کل آٹھ اولادیں پیدا ہوئیں جن میں چار لڑکے ''طارق معین الاسلام''، ''کمال ضیا الاسلام''، ''بلال شمشیر الاسلام''، ''جمال نذر الاسلام'' اور چار لڑکیاں ''فردوس آرا بیگم''، ''اجمیری رونق آرا بیگم''، ''سلطانہ ثروت آرا بیگم''، ''نادرہ بانو آرا بیگم'' تھیں۔ان کی تمام اولادیں ایک اچھی زندگی گزارنے میں کامیاب رہی ہیں۔راحت آرا بیگم بہت ہی مہذب خاتون تھیں۔وہ ہر کسی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔خاص طور سے وہ اپنے سسرال والوں سے بہت محبت کرتی تھیں اور اپنے سے جڑے ہر فرد کو خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتیں تھیں۔ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ان کی ازدواجی زندگی کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''راحت آرا بیگم کی ازدواجی زندگی بہت زیادہ کامیاب تھی، انہیں اپنے سسرال کے کسی فرد سے کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ ہر ایک سے وہ خوش تھیں اور ان کے سلوک و برتاؤ سے سسرال کا ہر فرد خوش تھا۔ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔''

(ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، راحت آرا بیگم کی افسانہ نگاری، مطبع درج نہیں، 1993، ص 17)

راحت آرا بیگم تقسیم ہند کے بعد مستقل سکونت اختیار کرنے کی غرض سے مع اہل و اعیال چٹا گانگ منتقل ہو گئیں، لیکن یہ کسے خبر تھی کہ چٹا گانگ ہی ان کا آخری آرام گاہ بنے گا۔اس نوعمر خاتون افسانہ نگار کا انتقال 29/فروری 1949 کو محض 39 سال کی عمر میں ہو گیا۔ان کے انتقال سے اردو کے افسانوی ادب میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔

راحت آرا بیگم کو زمانۂ طالب علمی ہی سے لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نویسی سے ہوتا ہے۔اس کے بعد انھوں نے افسانے اور شاعری میں طبع آزمائی کی۔ان کے مضامین، افسانے، غزلیں اور نظمیں اس وقت کے موقر رسائل کی زینت بنتے تھے۔ ان کی تخلیقات ''عصمت''، ''تہذیب نسواں''، ''سہیل''، اور'' بیسویں صدی کے علاوہ دوسرے رسائل میں بھی شائع ہوتی تھیں۔لیکن راحت آرا بیگم کو مضامین اور شاعری کے مقابلے میں افسانے میں زیادہ شہرت ملی۔شاعری میں ان کا صرف ایک مجموعہ ''دیوانِ راحت'' شائع ہوا ہے، جبکہ ان کے افسانوں کے سات مجموعے زیورِ طبع سے مزین ہیں۔ان کے افسانوی مجموعے کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(i) دلنواز (ii) بانسری کی آواز
(iii) انقلاب (iv) پریمی اور دیگر افسانے
(v) بدو کی بیٹی (vi) شب کی پکار
(vii) غنچۂ افسانہ

راحت آرا بیگم نے اپنے سبھی افسانوی مجموعوں کو کسی نہ کسی کے نام انتساب کیا ہے۔افسانوی مجموعہ ''دلنواز'' کا انتساب اپنی ماں ''عفت آرا بیگم'' کے نام کیا ہے۔اس مجموعے میں چار افسانے شامل ہیں: ''دلنواز''، ''اعتراف''، ''غلطی'' اور ''نوجوان طالب علم''۔یہ مجموعہ جملہ 124 صفحات پر مشتمل ہے، جسے کامریڈ پبلیشرز، کلکتہ نے 1945 میں شائع کیا تھا۔

افسانوی مجموعہ ''بانسری کی آواز'' میں بھی چار افسانے شامل ہیں، جن کے عنوانات ''بانسری کی آواز''، ''جوئف بریملو''، ''بکھارن کی کہانی'' اور ''محبت خدا سے ملاتی ہے'' ہیں۔ان کا یہ مجموعہ 160 صفحات پر مشتمل ہے، جس کو انھوں نے سر تیج بہادر سپرو کے نام معنون کیا ہے۔اس مجموعے کو تاج کمپنی لمٹیڈ، لاہور نے شائع کیا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''انقلاب'' میں بھی چار افسانے شامل ہیں۔یہ مجموعہ 160 صفحات پر مشتمل ہے اس مجموعے کو بھی تاج کمپنی لمٹیڈ، لاہور نے شائع کیا ہے، جس میں سنہ اشاعت درج نہیں ہے اور انتساب میں بھی کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔اس مجموعے کو افسانہ نگار نے اپنے سسر مولوی عبدالخالق کے نام معنون کیا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''پریمی اور دیگر افسانے'' میں بھی چار افسانے شامل ہیں، جن کے عنوانات ''پریمی''، ''شب کو--- آپ بیتی''، ''والی'' اور ''چندرا'' ہیں۔اس مجموعے میں بھی سنہ اشاعت درج نہیں ہے، یہ کل 129 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔راحت آرا بیگم نے اس مجموعے کو اپنے

والد محترم شمس العلما مولانا مولوی کمال الدین احمد کے نام انتساب کیا ہے۔ مجموعہ ''انقلاب'' کو ''نیرنگ خیال'' کے مدیر حکیم محمد یوسف نے اپنے پیش لفظ کے ساتھ نیرنگ خیال بک ڈپو، لاہور سے شائع کیا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''راحت آرا بیگم سرزمین بنگال میں پیدا ہوئی۔ بنگال جو رومان خیزی اور افسانوی ماحول میں پنجاب اور یوپی پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس لیے راحت آرا بیگم کے افسانوں میں ماحول فضا ہر جگہ دلچسپیوں اور رنگینیوں کے دامن گیر نظر آتی ہے۔''

(حکیم محمد یوسف حسن، افسانوی مجموعہ 'پریمی اور دیگر افسانے'، کامریڈ بنک لمٹیڈ، کلکتہ، سنہ اشاعت درج نہیں، ص5)

افسانوی مجموعہ ''بدو کی بیٹی'' بھی چار افسانوں پر مشتمل ہے، جو 1946 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کو انھوں نے اپنی خوش دامن یعنی ساس ''حلیمہ خاتون'' کے نام منسوب کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک افسانوی مجموعہ ''شب کی پکار'' ہے، جس کو انھوں نے سروجنی نائڈو کے نام معنون کیا ہے۔ ان کا آخری افسانوی مجموعہ ''غنچۂ افسانہ'' کے نام سے شائع ہوا، جس کا انتساب انھوں نے ''سلطان العلوم فرمانروائے دکن'' کے نام کیا ہے۔ یہ دونوں مجموعے بھی چار چار افسانوں پر مشتمل ہیں۔ اس طرح ان تمام مجموعوں میں راحت آرا بیگم کے جملہ 28 افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ ان کے کچھ افسانے متفرق رسائل میں شائع ہوئے ہیں، جن کا شمار نہیں کیا جا سکا ہے۔ راحت آرا بیگم نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک ڈرامے ''ڈاک گھر'' کا بنگالی زبان سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

راحت آرا بیگم کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کہانیوں کے مواد اپنے آس پاس کے ماحول سے اخذ کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں بنگال کے معاشرے کی صاف جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بنگال کے رہن سہن، طور طریقے، خان پان، تہذیب و ثقافت اور تہواروں کا ذکر بہت ہی خوب صورت انداز میں کیا ہے۔

راحت آرا بیگم کا افسانہ ''دلنواز'' رومانی قسم کا ہے۔ اس میں ایک کنیز ''دلنواز'' اور ایک شہزادہ ''شمشیر'' کی داستان محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دلنواز اپنی ماں کے ساتھ نواب کے محل میں بچپن سے آیا جایا کرتی تھی۔ جب بڑی ہوئی تو نواب صاحب نے اسے اپنے محل کی کنیزوں میں شامل کر لیا۔ کنیز دلنواز کا اصل نام سلیمہ تھا، لیکن نواب کی طرف سے اس کو دلنواز کا خطاب دیا گیا تھا۔ نواب کا بیٹا شمشیر دلنواز پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس سے بے انتہا محبت کرنے لگتا ہے۔ شہزادے کی اس محبت سے دلنواز ڈرنے لگتی ہے، لیکن بعد میں اسے بھی شہزادے سے بے انتہا محبت ہو جاتی ہے اور وہ شہزادے کی خوب خدمت کرنے لگتی ہے۔ پھر شہزادے کی شادی کر دی جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی محبت کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ دلنواز پہلے صرف شہزادے کی خدمت کرتی تھی اور اب میاں بیوی دونوں کی خدمت کرنے لگی تھی۔ دلنواز ان دونوں کا خیال رکھنے میں اتنا مصروف ہو جاتی ہے کہ خود کا خیال رکھنا بھول جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ جسمانی طور سے بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ ایک دن اچانک وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر جاتی ہے۔ شہزادے سے یہ دیکھا نہ گیا اور وہ اس آخری لمحے میں دلنواز پر جھک جاتا ہے، اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے اور اس کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگتا ہے، لیکن کامیاب نہیں ہوتا، کیوں کہ اب وہاں دلنواز نہیں رہتی، بلکہ وہاں صرف اس کا بے جان جسم موجود رہتا ہے، جس پر شہزادے کی آنکھ سے نکلے ہوئے آنسو ٹپک رہے تھے۔ یہ افسانہ تھوڑی بہت ڈراما انارکلی کی یاد ضرور دلاتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے، جس سے آپ کو خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

''یہ کیا دلنواز______!
یہ پھول تمھارے ہاتھ سے گر کیسے گئے؟''
وہ بہ دستور مسکرا رہا تھا۔
''اوہ! میں سمجھ گیا______! یہ نازک نازک سے ہاتھ ان پھولوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں______ کیوں؟''
اتنا کہہ کر اس نے دلنواز کا نرم و نازک ہاتھ آہستگی سے تھام لیا۔
دلنواز سہم کر وہیں بیٹھ گئی______ بہ مشکل اتنا کہا:
''شہزادے______ میری ہمت اس قدر نہ بڑھائیے۔ آہ! میں تو آپ کی ادنیٰ کنیز ہوں۔''
شہزادہ اس کے اور بھی قریب آ گیا۔ تھوڑی دیر اس کے جھکے ہوئے چہرے کو اوپر اٹھا کر بے ساختہ بول اٹھا۔
''کنیز______! نہیں نہیں دلنواز______ تم تو اس دل کی ملکہ ہو۔''

افسانہ ''چندرا'' میں ماں کی ممتا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ چندرا نام کی ایک عورت ہے جو بہت ہی رئیس ہے۔ اسے دنیا جہان کی تمام چیزیں میسر ہیں، لیکن اس کی گود خالی ہے، وہ اولاد کے سکھ سے محروم ہے۔ چندرا کا گھر نوکر چاکر سے بھرا ہوا

ہے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہے، سوائے اولاد کے۔ چندرا کے گھر میں کماری نام کی ایک بیوہ نوکرانی ہے، جس کی گود میں ایک آٹھ مہینے کا بیٹا ہے، جس کا نام رمیش ہے۔ رمیش کو دیکھ کر چندرا کی نیت خراب ہو جاتی ہے اور وہ کماری سے اس کا بیٹا لینے کی فراق میں لگ جاتی ہے۔ چندرا پہلے اپنے شوہر سے کماری کے بیٹے کو گود لینے کے لیے مشورہ کرتی ہے، جس پر اس کا شوہر کہتا ہے کہ کیوں کر کماری اپنی اولاد تجھے دے گی۔ شوہر کے سمجھانے پر بھی وہ نہیں مانتی اور کماری کو یہ یقین دلا کر اس کا بیٹا مانگ بیٹھتی ہے کہ وہ اس سے زیادہ اس کے بیٹے کو خوش رکھے گی۔

مالکن کی یہ بات سن کر کماری بہت پریشان ہو جاتی ہے اور سوچتی ہے کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے میں مالکن کے حوالے کر دوں۔ پھر یہ بھی سوچتی ہے کہ اگر میں ایسا نہیں کرتی تو مالکن مجھے نوکری سے نکال دیں گی۔ اسے یہ بھی خیال آتا ہے کہ مالکن کے حوالے کر دینے سے میرا بیٹا میری آنکھوں کے سامنے ہی تو رہے گا۔ میں اس کی پرورش تو کر سکتی ہوں، لیکن اچھی تعلیم نہیں دلا سکتی۔ مالکن کے پاس میرا بیٹا شہزادہ کی طرح زندگی گزارے گا۔ اس طرح بہت غور و فکر کے بعد کماری اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اپنے بیٹے کو چندرا کے حوالے کر دیتی ہے۔ چندرا رمیش کو پا کر بہت خوش ہو جاتی ہے۔ وہ کچھ دن تو بہت لاڈ پیار سے اس کی دیکھ بھال کرتی ہے، لیکن بعد میں اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک اور نوکرانی رکھ لیتی ہے۔ یہ دیکھ کر کماری کو بہت خراب لگتا ہے، لیکن وہ خاموش رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ پانچ سال کا وقت گزر جاتا ہے۔ چندرا رمیش کا خیال رکھنا پوری طرح چھوڑ دیتی ہے، اس کی دیکھ بھال کی پوری ذمے داری نئی نوکرانی کے ذمے ہو جاتی ہے، وہ جس طرح چاہتی ہے اسے رکھتی ہے۔ رمیش وقت گزرنے کے ساتھ بہت کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن کماری نے دیکھا کہ نئی نوکرانی اسے مار رہی ہے۔ یہ دیکھ کر کماری کی ممتا جاگ جاتی ہے۔ وہ پوری طرح بے چین ہو جاتی ہے اور چندرا سے اس بات کی شکایت کرتی ہے۔ چندرا کماری ہی کو غلط ٹھہراتی ہے اور کہتی ہے کہ اب رمیش کی ماں میں ہوں مجھے معلوم ہے کہ اس کی پرورش کیسے کرنی ہے۔ تم کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ چندرا کی یہ باتیں سن کر کماری پوری طرح ٹوٹ جاتی ہے۔ اب اسے رمیش سے ملنے بھی نہیں دیا جاتا۔ وہ رمیش کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ترس جاتی ہے۔ آخر کار رمیش ایک دن بیمار پڑ جاتا ہے اور بہتر علاج نہ ملنے کی وجہ سے اس کی موت ہو جاتی ہے، یہ خبر سن کر کماری اس کی لاش کے پاس پہنچتی ہے اور وہ خود بھی وہیں دم توڑ دیتی ہے۔

اس افسانے میں افسانہ نگار نے ماں کی ممتا کو اس قدر جذباتی بنا کر پیش کیا ہے کہ ایک ماں کا اپنے بچے سے لگاؤ کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ ماں کی ممتا کا اندزہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کماری اپنے بچے کے لیے تڑپ رہی ہے اور چندرا رمیش سے محبت کرتی ہے۔ چوں کہ کماری رمیش کی حقیقی ماں ہے اور چندرا اس کی مصنوعی ماں ہے۔ اسی لیے آگے چل کر چندرا کی محبت تو کمزور پڑ جاتی ہے، لیکن کماری کی ممتا آخری دم تک رہتی ہے۔ لہٰذا ممتا ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے اور محبت صرف وقتی ہوتی ہے۔

افسانہ ''بانسری کی آواز'' میں ایک ان دیکھے محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ الماس نام کی ایک لڑکی ہے، جس کے کانوں میں بہت دنوں سے بانسری کی آواز آتی رہتی ہے۔ الماس اس آواز کو سن کر پاگلوں کی طرح اس آواز کی طرف بھاگنے لگتی ہے، لیکن اسے کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ اسی بے چینی کے عالم میں کوئیں سے پانی لینے کے بہانے اپنی سہیلی زہرہ کے پاس جاتی ہے اور اپنی پوری کیفیت اسے بتاتی ہے۔ زہرہ الماس کی ماں سے بات کر کے اپنی سہیلی کو کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر لے جاتی ہے اور کہتی ہے کہ تو پریشان مت ہو، میں کسی نہ کسی طرح اس بانسری بجانے والے کو تلاش کر لوں گی۔

ایک دن زہرہ کوئیں پر پانی بھرنے کے لیے جاتی ہے تو دیکھتی ہے کہ ایک لڑکا پیڑ کے نیچے بیٹھ کر بانسری بجا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ وہ کلسی کو کوئیں کے پاس رکھ کر تیز تیز قدموں سے اس کے پاس پہنچ جاتی ہے اور کہتی ہے:

> ''تم ___ تم کون ہو اے بانسری کے مالک؟''
> زہرہ نے رُک رُک کر پوچھا۔
> ''اور تم کون ہو اے خوب صورت لڑکی۔''
> ''نہیں۔'' زہرہ نے آواز پر زور دے کر کہا ''کھیل کی بات نہیں۔ اپنی لبھانے والی بانسری کی آواز موقوف کرو۔ یا بتاؤ تم کون ہو؟ میری سہیلی الماس! آہ! تمہاری بانسری کی سریلی آواز نے اسے بے چین کر رکھا ہے، اس کا بچنا محال ہے۔''

(راحت آرا بیگم، بانسری کی آواز، تاج کمپنی لمٹیڈ، لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں، ص12)

زہرہ کی اس طرح کی باتیں سن کر وہ اپنے بارے میں بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا نام جمال ہے اور لوگ مجھے جمال دیوانہ کہتے ہیں، میں پاس کے گاؤں ہی میں رہتا اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ میں اسی لڑکی سے شادی کروں گا، جو میری بانسری کی دھن سن کر میری دیوانی ہو جائے۔ کل تم اس لڑکی کو میرے پاس لے کر آؤ۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ اگلے دن زہرہ اپنی سہیلی الماس کو جمال سے ملواتی ہے اور دونوں کی ان دیکھی

محبت پیار میں بدل جاتی اور دونوں شادی کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ اگلے ہی دن الماس اپنے گھر جاتی ہے اور سنتی ہے کہ اس کے ماں باپ اس کی شادی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ اس بات کو سن کر وہ گھبرا جاتی ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے اسے پتہ چلتا ہے وہ لوگ اسی بانسری والے لڑکے ہی سے اس کی شادی کی بات کر رہے ہیں تو وہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتی۔ آخر کار اگلے ہفتے ہی الماس کی شادی جمال دیوانہ سے کر دی جاتی ہے اور دونوں خوشی خوشی اپنی اِزدواجی زندگی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح ان کے افسانے ''پریمی'' میں بنگالی ہندو کی معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔ ''والی'' ایک معمولی افسانہ ہے، لیکن موضوع اچھوتا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''جوئف بریملو'' اپنی کردار نگاری کی وجہ سے اہم ہے۔ ''شب کی پکار'' بھی دل کش افسانہ ہے، اس میں ایک الگ طرح کا تاثر ملتا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک افسانہ ''انصاف'' کے عنوان سے ہے، جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اکثر گناہ مرد کرتا ہے اور خمیازہ عورت کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں کے موضوعات میں بو قلمونی ہوتی ہے اور ان کے کردار بھی سماج کے ہر طبقے سے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، راحت آرا بیگم کے افسانوں کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''ان کے افسانے مقصدیت سے خالی نہیں ہیں اور آج سے پچاس سال پہلے افسانہ نگار نے سماج کی ان خوبیوں، خامیوں پر روشنی ڈالی ہے، جو آج بھی ہندوستانی سماج کا حصہ ہیں ، جس سے ان کی مطالعہ اور مشاہدہ کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار تقریباً ہر حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ غریب امیر، بے انتہا دولت مند، شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے عورت و مرد، پس ماندہ طبقہ کے افراد، بچے بوڑھے، تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ ہر طرح کے کردار بڑی کامیابی سے تراشے ہیں۔ کبھی کبھی زبان کی ایک آدھ غلطی کھٹکتی ہے مگر خیالات کی روانی اور تسلسل نے اس عیب کی پردہ پوشی کر ڈالی ہے۔''

(ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، راحت آرا بیگم کی افسانہ نگاری، مطبع درج نہیں، 1993، ص 29-28)

المختصر یہ کہ راحت آرا بیگم بنیادی طور پر افسانے کے فنی لوازمات سے پوری طرح واقف نظر آتی ہیں۔ ان کے اکثر افسانے کافی طویل ہوتے ہیں، لیکن قاری کو ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے میں کسی قسم کی کوئی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ ان کے طویل افسانوں کے پلاٹ میں بھی کسی قسم کا سقم یا الجھاؤ نہیں ہوتا ہے۔ قاری ایک بار ان افسانوں کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ ان کے کرادر بالکل ہمارے آس پاس کے معلوم ہوتے ہیں ، جن میں کسی قسم کی بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار بالکل جیتے جاگتے اور متحرک معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مکالمے بھی ہوتے ہیں ، لیکن بہت کم۔ منظر نگاری اس خوب صورتی سے کرتی ہیں کہ پورا کا پورا عکس قاری کو آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جزئیات نگاری بھی با کمال ہوتی ہے کہ ہر جزو کے رشتے کو قاری با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عنوان اور نقطۂ نظر کے رشتے کو بھی بخوبی اجاگر کرتی ہیں۔ زبان و بیان اس قدر سادہ اور صاف ہوتی ہے کہ قاری کو افسانے کی تہہ تک پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہاں تک کہ راحت آرا بیگم کے افسانے فنی چابکدستی سے پوری طرح معمور ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی نہ جانے کیوں افسانوی ادب میں ان کو وہ مقام نہ مل سکا جس کی وہ اصل حق دار تھیں۔ مجھے امید ہے کہ آگے آنے والے وقت میں ان کے افسانوں کا بغور مطالعہ کیا جائے گا اور افسانوی ادب میں ان کو ایک خاص مقام حاصل ہوگا، جس کی وہ مستحق ہیں۔

□□□

Ms. Naghma Tabassum
Chasapatti Main Road, Rahmat Nagar
Burnpur, Pashcim Bardhaman
Asansol-713325 (West Bengal)
Mob: 7430867481

اپیل

ماہنامہ خواتین دنیا آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے اپنی گرانقدر رائے سے ضرور نوازیں۔ میگزین میں شائع ہونے والے مضامین، عنوانات اور مختلف ادبی شخصیتوں کی نشاندہی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ رسالے کو مزید بہتر بنانے میں ہمیں مدد مل سکے۔ (ادارہ)

زینت پروین

انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا شاعر

ساحر لدھیانوی

نہ منہ چھپا کر جیے ہم، نہ سر جھکا کے جیے
ستمگروں کی نظر سے نظر ملا کے جیے
اب ایک رات اگر کم جیے، تو کم ہی سہی
یہی بہت ہے کہ ہم مشعلیں جلا کے جیے

ساحر لدھیانوی کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ بیک وقت اپنے آپ میں ایک معمار تھے۔ ستمبر 1980 کو ساحر لدھیانوی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انھوں نے اپنے پیچھے اپنی علمی و ادبی کاوشوں اور انسانی رشتوں کا ایک ایسا اثاثہ چھوڑا ہے کہ وہ نہ صرف گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں ان کے ساتھیوں بلکہ ساری دنیا میں ان کے ہم عصر عالموں، دانشوروں، اور اسکالروں کے لیے بھی ہر دل عزیز اور قابل تعظیم شخصیت بن گئے۔

سنجیدہ و متین اقدار کہنہ کے امین، شخصیت جاذب نظر، گفتگو پر اثر، آنکھیں شمع امید سے روشن ذات ایک انجمن، دل میں خدمات اردو کا جذبہ اور بے مثال شعری مجموعوں کے خالق ''عبدالحی'' 8 مارچ 1921 میں لدھیانہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے اور ساحر لدھیانوی بن کر اردو ادب کی خدمات کرتے رہے۔ والد کا نام چودھری فضل محمد تھا جو ایک بڑے جاگیر دار تھے۔ ساحر کی والدہ سردار بیگم ان کے والد کی گیارہویں بیوی تھیں اور ان سے ہی ساحر اپنے والد کے اکلوتے اولاد ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔

ساحر کی والدہ اس جاگیردارانہ نظام کے رویے کی سخت خلاف تھیں اور اس وجہ سے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اپنے بیٹے کو اس جھوٹی شان و شوکت سے دور رکھنا چاہتی تھیں اس وجہ سے وہ اپنے بھائیوں کے گھر ساحر کو لے کر چلی جاتی ہیں۔ اس وقت ساحر کی عمر محض سات سال تھی۔

ساحر کی والدہ انھیں پڑھا لکھا کر ڈاکٹر، افسر اور اچھا انسان بنانا چاہتی تھیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم ماں ہی کی سرپرستی میں ہوئی اس کے بعد مالدہ خالصہ اسکول میں اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی اور ان کے ابتدائی استاد مولانا فیاض ہریانوی کو حاصل ہے ساحر نے ان سے ہی اردو و فارسی دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ اس وقت لدھیانہ ہی اردو زبان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس لیے ساحر نے لدھیانہ کے زیر اثر شعر و ادب میں خاصی دلچسپی لینی شروع کی۔ اس وقت ساحر میٹرک کے طالب علم تھے اور اس عمر سے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ ساحر نے اقبال کے مرثیہ داغ کے اس شعر سے اپنا تخلص ساحر رکھا۔

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی

ساحر نے جب اردو شاعری میں قدم رکھا اس وقت ترقی پسند شاعروں کی شہرت و مقبولیت کا ہر طرف چرچا تھا۔ ایسے میں اپنے آپ کو

سب سے منفرد بنانا ایک مشکل کام تھا پر انھوں نے اپنے بچپن کے ماحول اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ان کے دل میں عجیب و غریب شاعری نے جنم لیا اور انھوں نے جتنے دکھ تکلیف جھیلے ان سب کو اپنی شاعری میں بیان کر دیا اور اردو ادب میں اپنی پہچان بنائی ۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر نے اپنی شاعری میں تجربات اور اپنے بچپن سے لے کر جوانی تک کے تمام حادثات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔اس بحث سے متعلق ساحر خود لکھتے ہیں کہ۔۔

"اچھی شاعری بھلے ہی کسی مخصوص نظریہ پر پوری نہ اترتی ہو لیکن اس سے اس کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ڈاکٹر اقبال سے شدید ترین مخالفت ہونے کے باوجود میں ان کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوں۔لکھتے وقت ادیب کو اپنی شخصیت کے ساتھ سچا رہنا چاہیے۔جو کچھ بھی کہا جائے اس میں ضمیر کی شرکت ضروری ہے یعنی اندر سے بھی کچھ ایسا لگتا ہو نہیں تو ان کہی بات اندر ہی اندر گولا بن جائے گی۔شعر کہنے کے بعد اس پر کون سا لیبل چسپاں کیا جائے یہ ادیب کی نہیں لیبل فروشوں کے سوچنے کی بات ہے۔ادیب در حقیقت شخصیت کے اظہار کا نام ہے۔یہ ایک نفسیاتی عمل ہے اگر ادیب اپنے مزاج کے خلاف کسی لیبل کے لیے لکھتا ہے تو اندر سے کوئی تسکین نہیں ہوگی۔۔"

(ساحر لدھیانوی حیات اور خدمات،ڈاکٹر نغمہ پروین،سرسوتی پریس،الہ آباد،جنوری 2007، صفحہ 166)

ساحر نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مثلاً غزل،نظم، گیت مگر ان کی شہرت کا سبب ان کی نظمیں ہیں۔ساحر کا پہلا شعری مجموعہ "تلخیاں" جذباتی،رومانی،اور انقلابی شاعری کا دلچسپ بیان ہے۔ان کے یہاں شور و پکار نہیں احتجاج ہے۔ان کے نظموں میں ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کا پیغام بھی تھا اور جمہوری و اشترا کی نظام قائم کرنے کا حوصلہ بھی،اور جو سماجی استحصال کے خلاف صدائے احتجاج کا اعلان کرتی ہے اور محبوب کی ناکامی کا احساس بھی دلاتی ہے۔ساحر کی ابتدائی نظموں سے متعلق حافظ لدھیانوی کی رائے ہے کہ ان میں نعرہ بازی زیادہ تھی۔ حافظ لدھیانوی کے مضمون کے اقتباس دیکھیں۔۔۔۔

اس کی شاعری کا آغاز انقلاب کے نعرہ سے ہوا۔اس کی ابتدائی شاعری میں،شاعری کم تھی اور نعرہ بازی زیادہ،شعر میں وہ پختگی،بات کرنے کا ڈھنگ،زبان و بیان کا آہنگ نامانوس تھا آج بھی مجھے اس دور کے چند اشعار یاد ہیں جن سے اس کی شاعری کے آغاز کا پتہ چلتا ہے"۔

(ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے،ڈاکٹر انور ظہیر انصاری،ایجوکیشنل بک ہاوس 2004، صفحہ 22)

مرا کیا ہے مجھے کھانسنے میں خون آتا ہے
چراغ زندگی بجھنے کو ہے اب ٹمٹماتا ہے
مجھ کو جانے دو کہ میرا منتظر ہے انقلاب
دیکھ ابھرا چا ہتا ہے عصر نو کا آفتاب

ساحر اپنے والد اور والدہ کے بیچ ہو رہے تناؤ کی وجہ سے ذہنی خلفشار کا شکار تھے جس کی وجہ سے ان کے دل و دماغ میں انقلاب برپا ہونے لگا اور اس وجہ سے انھوں نے اپنے اطراف کی سبھی چیزوں کو ایسی نظروں سے دیکھا جس سے عام و خاص شخص نظریں چھپائے پھیرتے ہیں مگر ساحر نے اس چھپے پہلوں کو اپنی نظموں میں حق بجانب پیش کر دیے۔نظم "تاج محل" اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔۔۔

تاج تیرے لیے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادی رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
یہ عمارت و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینہ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خون
یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارہ لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

درج بالا نظم میں ساحر نے تاج محل کا وہ روپ بیان کیا ہے جو شاید اب تک کسی شاعر کی نظروں سے نہیں گزرا کہ ایک غریب کی محبت کسی تاج

محل کی محتاج نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی غریب کا خون پسینہ اپنی محبت کو زندہ رکھنے کے لیے بہایا جاتا ہے۔ساحر نے بہت ہی انوکھے انداز میں تاج محل کے پیچھے چھپے پہلوں کو بیان کیا ہے۔اس نظم کے شائع ہوتے ہی ساحر ہندوستان کے ایک مشہور اور معروف شاعر بن گئے۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں جو چیز انھیں دوسروں سے الگ کرتی ہے وہ ان کا شعری مواد ہے۔انھوں نے پیغامِ بیداری،نوجوانوں کو جینے کا نیا مقصد اور اپنے انوکھے طرزِ بیان کا بخوبی استعمال کیا ہے۔

ساحر نے پہلے رومانی شاعری کی تھی مگر جب ہر طرف کارل مارکس کا اثر بڑھنے لگا تو انھوں نے بھی ان سے متاثر ہو کے ان گنت نظمیں لکھ دیں جن میں ''تمھارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے''،''سوچتا ہوں''، ''ناکامی''، ''مجھے سوچنے دے''، اور ''گریز'' وغیرہ۔جب بنگال میں 1944 کا قحط پڑا تو ان سے بھی متاثر ہو کر ساحر نے ''قحط بنگال'' جیسی نظم بھی لکھی:

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمین نے کیا اسی کا رن اناج اُگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بِلک بِلک کے مرے
زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوند!
مِلوں کے منتظموں ! سلطنت کے فرزند!

ساحر لدھیانوی ترقی پسند شاعر تھے۔انھوں نے اپنی آنکھوں سے ہندوستان میں ہو رہے جنگ اور ملک کی تقسیم کے واقعات بیان کیا ہے۔ ساحر لدھیانوی کے دل میں غم و آلام کا احساس تھا وہ انسان دوستی اور دوست نوازی کے نظریے کے پیرو کار تھے۔دوستوں کے ہمدرد اور آشناؤں کے غم گسار تھے۔''یہ کس کا لہو ہے'' اور ''خون پھر خون ہے'' ایسی نظمیں ہیں جس میں جنگ سے پیدا شدہ منظر کو پیش کیا گیا ہے۔

اے رہبرِ ملک و قوم ذرا آنکھیں تو اٹھا نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سنیں،ہم کو بھی بتا یہ کس کا لہو ہے کون مرا
دھرتی کی سلگتی چھاتی کے بے چین شرارے پوچھتے ہیں
تم لوگ جنھیں اپنا نہ سکی وہ خون کے دھارے پوچھتے ہیں
سڑکوں کی زباں چلاتی ہے،ساگر کے کنارے پوچھتے ہیں
یہ کس کا لہو ہے کون مرا اے رہبرِ قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

خون پھر خون ہے
ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
خاک صحرا پہ جمے یا کف قاتل پہ جمے
فرق انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغ بیداد پہ یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

تیسری عالمی جنگ کے بعد پورے ملک میں عالمی امن تحریک چلائی گئی۔ساحر نے عالمی امن کے موضوع پر 1955 میں نظم ''پرچھائیاں'' لکھی جو 184 مصرعوں پر مشتمل ایک شاہکار ڈرامائی نظم کہلاتی ہیں۔اس نظم سے متعلق علی سردار جعفری نے لکھا ہے کہ۔

''ساحر نے اپنی بات ایک کہانی کی شکل میں کہی ہے اور کہانی نظم کو زیادہ عام فہم بنا دیتی ہے۔ہماری بعض بہترین نظمیں عام انسانوں کی سمجھ کی سطح سے بہت اونچی ہیں۔لیکن ساحر کی نظم ''پرچھائیاں'' اپنی سادہ کہانی اور آسان بیانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچ سکے گی۔۔۔''

(''پرچھائیاں'' ساحر لدھیانوی،مکتبہ جدید لاہور 1955،صفحہ 11)

ساحر کی شاعری کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں سیدھی سادی زبان اور عام فہم الفاظ کے ذریعہ اپنے سچے خیالات وجذبات کو بیان کرنے میں ہر جگہ کامیاب رہے ہیں۔

ساحر لدھیانوی جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے خون میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ موجود تھا۔وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات پسند نہیں کرتے تھے وہ اپنی بات دلیل کے ساتھ پوری کرنے کا ہنر رکھتے تھے۔ساحر جاگیردارانہ نظام کے سخت خلاف تھے اور انھوں نے سب کو ایک برابر ایک نظر سے دیکھا۔کالج کے زمانے میں وہ کالج کے اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری منتخب ہوئے اور آخری سال وہ اسٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی منتخب کیے گئے۔اس وجہ سے ساحر کو شروع سے ہی مجبور و مظلوم لوگوں سے ہمدردی بڑھ گئی۔سماج میں ہو رہی ذاتی مصائب کے شکار طبقہ کی نمائندگی انھوں نے اپنی شاعری میں کی۔ساحر کی شاعری میں عورتوں کی زبوں حالی کو بھی بخوبی بیان کیا گیا ہے۔

ساتھیوں! میں نے برسوں تمہارے لیے
چاند تاروں بہاروں کے سپنے بنے

حسن اور عشق کے گیت گا تا رہا
ملک کی وادیاں گھاٹیاں کھیتیاں
عورتوں، بچیاں
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ننھے بچوں کو ان کی خوشی بخش دو
ملک کی روح کو زندگی بخش دو

ساحر لدھیانوی سماج کو بہتر بنانے کا پیغام دیتے تھے اور ادب کو ایک اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کی سوچ تھی کہ ادیب کو سماج سے الگ تصور نہیں کر سکتے اور ساحر کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی ابتداء سماجی موضوعات سے ہی کی۔

جاگیردارانہ نظام کو سحر پسند نہیں کرتے تھے۔ جاگیرداروں نے اپنی جھوٹی شان وشوکت کو برقرار رکھنے کے لیے انگریزی حکومت کی چاپلوسی کو وجہ سے جاگیرداروں نے عام انسانوں کی جو حالت کی تھی اس کا نقشہ انھوں نے اپنی نظم ''جاگیر'' میں پیش کیا ہیں۔۔۔

پھر اس وادی شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس کی جرات ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے
یہ لہکتے ہوئے پودے یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ساحر لدھیانوی نے نظمیں لکھیں، گیت لکھے، غزلیں بھی لکھیں۔ ساحر کی غزلیں بھی کسی سے کم نہیں مثال دیکھیں۔

جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سرِنو داستان ِشوق دہرائی گئی
بک گئے جب تیرے لب پھر تجھ کو کیا شکوہ اگر
زندگانی نادہ و ساغر سے بہلائی گئی
اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی
ہم کریں ترک وفا اچھا چلو یوں ہی سہی
اور اگر ترک وفا سے بھی نہ رسوائی گئی
دل کی دھڑکن میں توازن آ چلا ہے خیر ہو
میری نظر بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی

لہٰذا یہ کہنے میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اشعار کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ ہر ایک شعر کے فنی لوازمات اور جمالیاتی پہلو کے قائل ہیں۔ ان کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات کو سادہ لہجے میں کہہ جاتے ہیں:

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ، کہیں نعرہ، کہیں پتھر بن کر
خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

(خون پھر خون ہے)

ساحر لدھیانوی وطن پرست، مساوات، عالمی امن، آزادی و انصاف پسند شخص تھے۔ وہ ملک کی بھلائی اور آزادی کے لیے ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ عالمی سطح پر انسانوں کا بھلا چاہتے رہے۔ ساحر نے اپنی پوری زندگی دوسروں کے لیے گزار دی۔ ساحر نے جو کچھ بھی لکھا انسانیت کے لیے ہی لکھا۔

المختصر ساحر کے کلام سے اپنی پسند کے چند اشعار کو پیش کر کے اپنے اس مضمون کا اختتام کرتی ہوں۔

سزا کا حال سنائیں جزا کی بات کریں
خدا ملا ہو جنھیں وہ خدا کی بات کریں
انھیں پتہ بھی چلے اور وہ خفا بھی نہ ہوں
اس احتیاط سے کیا مدعا کی بات کریں
ہر ایک دور کا مذہب نیا خدا لایا
کریں تو ہم بھی مگر کس خدا کی بات کریں
وفا شعار کئی ہیں کوئی حسیں بھی تو ہو
چلو پھر آج اسی بے وفا کی بات کریں

❑❑❑

Zeenat Parween
Hussain Nagar
Raniganj
Distt. Pashchim Bhardhaman-713347
West Bengal

الجبرا کا بانی
الخوارزمی

فرحین انجم

انھوں نے قدیم زمانے سے اب تک عالمگیر شہرت پائی جن کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ خوارزمی دراصل 780 عیسویں کے قریب پیدا ہوئے۔ ان کے نام سے ظاہر ہے کہ ان کا تعلق وسطی ایشیائی ملک ازبکستان کے ایک صوبے خوارزم سے تھا اور ان کی وفات 850 عیسوی میں ہوئی۔ عرب کے پہلے سائنسداں تھے۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی انھوں نے الجبرا پر بہت زیادہ کام کیا۔ یوں کہیے کہ الجبرا ان کے بغیر نامکمل ہے۔

جس میں یونانی اور ہندی حساب کو ملایا اور دنیا کی پہلی کتاب "الجمع و التفریق" لکھی۔ خوارزمی نے ہندو ماہرین ریاضی سے استفادہ کرتے ہوئے اعداد میں 'صفر' (0) کا اضافہ کیا۔ الخوارزمی کا سب سے بڑا کارنامہ الجبرا و المقابلہ ہے۔ جسے آج ''الجبرا'' کے نام سے اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں پڑھایا جاتا ہے۔ مختلف قسم کی ریاضی کی معلومات کا استعمال زمانے قدیم سے ہی ہے اور قدیم مصر بین النھرین و قدیم ہندوستان کی تہذیب میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ الجبرا (X) آج تک نامعلوم ہے۔ اب تک فادر آف الجبرا خوارزمی ہے۔ یہ معلمی پیشہ سے منسلک ہوئے الجبرا ان کی فکر اور تخلیق ذہانت کا آئینہ دار ہے۔ ان کی نسل ایرانی تھی زبان عربی اور فارسی تھی ان کا پیشہ فلکیات ریاضی تھا۔ عربی زبان میں اپنی تمام تصنیف شائع کیں۔ خوارزمی نے علم الحساب اور الجبرا کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا۔ اس سے قبل یہ دونوں ایک تصور کیے جاتے تھے۔ ''لفظ الجبرا'' ایجاد کردا نام انہی کا ہے۔ انھوں نے عربی اعداد کا استعمال کیا۔ اعداد میں اعشاریہ '' ء '' متعارف کروایا۔

علم الحساب اکافی کا مرتبہ دو چند کرنے اور دس دس دفعہ درجہ بدرجہ اس کی قیمت کم کرنے کا حسابی قاعدہ جس میں (ء) کی علامت کی بائیں طرف اعداد صحیح اور داہنی طرف اعداد سود ہوتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے صفر کا استعمال کیا۔ علم ریاضی میں یہ ایک انقلاب تھا جو آج تک اپنی افادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ خوارزمی کی مشہور تالیفات انھوں نے جتنے علوم سیکھے سب کتابی ہیں۔ الخوارزمی نے اپنی لکھی ہوئی کتابیں وراثت اور وصیتوں کے بارے میں ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی۔ اس میں جائیداد کی تقسیم تجارت اور اس کے احکام وغیرہ شامل ہیں۔ کتاب الفن الھندی فی الحساب الخوارزمی اس کتاب میں جدید عربی اعداد کا ذکر کیا گیا ہے۔ (کتاب الزیج) اس کتاب میں سائنس اور کوسائن کے ٹرونومیٹرک افعال کی میزوں پر توجہ مرکوز کی۔ کتاب سمن ظہور الارض میں جغرافیائی خصوصیات موجود ہیں۔ اس کے حرف ایک کافی سٹراپیرک یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ایک ایسا جملہ جو الجبرای عوامی () کے ذریعہ متغیر اور منتقل کو آپس میں ملاتے اسے الجبرای جملے کہتے ہیں۔ الخوارزمی نے گھٹاؤ اور ترازو متعارف کرایا (تفریق کی کئی اصطلاحات کو مساوات کی دوسری طرف لے گئے۔ الجبرا کا شعبہ ابتدائی بہت وسیع ہے۔

الخوارزمی کو کمپیوٹر کا باپ کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر پروگرامنگ میں خوارزمی کے ایجاد کردہ انگورتھم استعمال ہوتے ہیں۔ ریاضی کے قاعدے بنانے اور اسے ترقی دینے میں مشہور مسلم سائنسدان محمد ابن موسیٰ الخوارزمی کا کردار اہمیت کا حامل ہے، وہ فیثاغوریث کے زمانے سے ریاضی کے سب

سے بڑے عالم مانے جاتے ہیں۔الخوارزمی نے علم الجبرا کی بنیادرکھی۔ان کی وضع کردہ گنتی آج تک مشرق ومغرب میں رائج ہے۔انھوں نے زیادہ تر تحقیق 813 سے 833 کے درمیان بغداد کے دارالحکومت میں مکمل کی جس کی بنیاد خلیفہ مامون نے رکھی تھی۔الخوارزمی وہ پہلا انسان ہے، جس نے حروف کی بجائے الفاظ کا استعمال کیا۔الخوارزمی اپنی زندگی میں بہت اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔وہ زندگی کے آخری حصے میں بغداد آئے تھے۔ اس وقت بغداد ایک وسیع اسلامی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔جس پر طاقتور خلافت عباسیہ کی حکمرانی تھی۔ وہ بغداد میں خلیفہ المامون کے لیے کام کرتے تھے۔الخوارزمی کی سرپرستی میں متعدد محققین نے مل کر سورج اور چاند سے متعلق مشاہدے کیے۔انھوں نے لوگوں کی روزمرہ کی زندگی میں بہت کامیابی حاصل کی۔

الکتاب المختصر فی حساب الجبرا والمقابلہ 820 میں تخلیق کی جانے والی علم ریاضی ایک کتاب ہے جسے مسلم سائنسداں محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے تحریر کیا تھا۔اوراس کتاب کے نام کوانگریزی میں

The Compendious Book on Calculation by Completion and Balancing

اس کتاب کوحساب الجبرا والمقابلہ اور کتاب الجبرا والمقابلہ کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔عہد حاضر میں استعمال کیا جانے والا لفظ Algebra اصل میں اسی کتاب کے عنوان اورمتن میں استعمال کی گئی عربی اصطلاح جبراورالجبرا سے ماخوذ ہے۔اورموجودہ الجبرا(یعنی جبر) کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔کتاب الجبر خامہ، کتاب العمل بالاسرلاب ، اورمشہور کتاب الجبراوالمقابلہ جسے انھوں نے لوگوں کے روزمرہ اور معاملات کے حل کے لیے تصنیف کیا۔ جیسے میراث ، وصیت ،تقسیم ،تجارت خرید وفروخت،کرنسی کا تبادلہ(ایکسچینج)،کرایہ عملی طور پر زمین کا قیاس (ناپ)، دائرہ اور دائرہ کے قطر(Cliameter) کا قیاس بعض دیگر اجسام کا حساب جیسے ثلاثی، رباعی اور مخروط وغیرہ۔ اس میں سے ایک کارنامہ (صورۃ الارض)نام کتاب کی تصنیف بھی ملتی ہے جس میں انھوں نے مختلف قدرتی آدم ساز(انسانوں کے بنائے ہوئے) خطے مثلاً پہاڑوں، سمندروں ، جزیروں ، دریاؤں،نہروں اور شہروں کو ان کے ناموں کی ترتیب کے اعتبار سے ارضیاتی نقطہ جات جس وقت اور تصحیح کے ساتھ ذکر کیا ہے۔یہ پہلے سائنسداں تھے جنھوں نے علم حساب اور علم جبر کو الگ الگ کیا اور جبر کو عملی اور منطقی انداز میں پیش کیا۔انھوں نے نہ صرف جدید جبر کی بنیاد رکھی بلکہ علم فلک میں بھی اہم دریافتیں کیں۔ان کا زیج علم فلک

کے ایک طویل عرصہ تک ریفرنس رہا۔آپ کا پورا نام
ابو موید اور ابو محمد موفق بن احمد بن ابو سعید اسحاق بن موید مکی حنفی، معروف بہ اخطب خوارزم ہے۔ان کے طبع شدہ اور اشعار موجود ہیں۔ آپ کے بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں۔ حافظ نجم الدین عمر بن محمد بن احمد نسفی(متوفی 537ھ) ۔ابوالقاسم جار اللہ محمد بن عمر متوفی 567) جس مقابیں ذکر ہوا ہے۔وہ لوگ جنھوں نے اپنی سے روایت نقل کی ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں۔ابوجعفر محمد بن علی بن شہر آشوب سروی مازندرانی اور کچھ کتاب مناقب کے آغاز میں بیان ہوا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان خط و کتابت ہوتی تھی۔آپ کے بہت زیادہ تالیفات ہیں جن میں سے سات کتابیں بہت زیادہ مشہور ہوئیں۔

ابتدائی الجبرا کے قوانین

عالموں کے خاصے

الجبرا کا رتبہ

پھر انھوں نے مساوات کے خاصے بھی بتائے ہیں۔مساوات کے قوانین نامساوات کے قوانین جسے ایک متغیر میں لکیری مساوات ،حکوری مساوات۔ اسی اوراگرتھم مساوات، مساوات، جزر مساوات ۔مساوات کا نظام طریقہ اخراج، ناقابل حل نظام، الکبری مساوات کی دوسری اقسام، غیر جبر نظام ، حلیت اور خبریت میں نسبت ،وغیرہ قوانین ہیں۔سرسری طور پر دیکھنے یا سننے سے لگتا ہے کہ الجبرا جدید اصلاح ہے لیکن اصل میں یہ لفظ تقریباً 300 سال پرانا ہے ۔ یہ لفظ عربی ریاضی دان محمد ابن موسیٰ الخوارزمی کے نام سے نکلا ہے۔300 سال بعد یہ کتاب میں عربی اعداد سے روشناس کرایا اور رومن اعداد کو تبدیل کردیا۔الخوارزمی نے دریائے

نیل مصبع اور اس کے راستے کو جغرافیہ کی ایک کتاب میں بنایا۔ اعشاریہ اور ہندو عربی نمبروں کے نظام کو خوارزمی نے اپنی کتاب میں دنیا میں آج کل کا استعمال کیے جانے والے نمبروں کی بنیاد بتایا ہے۔ خوارزمی کا نام جب ان کی کتاب پر لاطینی میں لکھا گیا تو اسے الگورتھم لکھا گیا اور یہاں سے الگورتھم کا لفظ ریاضی میں استعمال ہونا شروع ہوا۔

(1) کتاب ''مناقب الامام ابی حنفیہ''

(2) کتاب ردالشمس (امیر المومنین علی علیہ السلام)

(3) کتاب الاربعین فی مناقب النبیؐ الامین ووجیہ امیر المومنین (علیہ السلام)

(4) کتاب قضایا امیر المومنین (علیہ السلام)

(5) کتاب ''مقتل الامام البسط اشہد'' (علیہ السلام)

(6) دیوان شعر کتاب ''کشف الظنون'' میں ذکر ہوا ہے۔

(7) کتاب ''فضائل امیر المومنین (علیہ السلام) جو مناقب کے نام سے مشہور ہے اور 1224ھ میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔ وہ خلیفہ المامون سے منسلک ہوئے جنھوں نے ان کے خواب اکرام کیا۔'' بیت الحکم'' سے بھی منسلک ہوئے اور معتبر سائنسدانوں اور علما میں شمار ہوئے۔ انھوں نے ریاضی ایجاد کی۔

ان کی ضروریات اور معاملات کے حل کے لیے تصنیف کیا۔ جسے محمد ابن موسیٰ الخوارزمی ایک فارسی ریاضی دان ماہر فلکیات نجومی جغرافیہ نگار اور ایک اسکالر تھے۔

Farheen Anjum
Paradise Colony
Near New Hanuman Nagar
Plot No. 15, Amravati- 444604 (M.S)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................بتاریخ.............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009،A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

روحی جان

اردو ادب میں جموں و کشمیر کی خواتین کا حصہ

خواتین ہمارے سماج کا ناگریز حصہ ہیں۔اس حقیقت کا اعتراف پوری دنیا فراخدلی اور کشادہ ذہنی کے ساتھ کر رہی ہے۔کسی بھی ملک کے افراد کی تہذیبی وتمدنی صورت حال، علمی وادبی کاوشیں سیاسی وسماجی اور فنی خصوصیات جیسے کارناموں کی تاریخ خواتین کا تذکرہ کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔مرد کے وجود ہی سے عورت کا وجود بنایا گیا تاکہ یہ ایک دوسرے سے سکون اور انس حاصل کرسکے۔دونوں ایک دوسرے سے سبقت لینے کے بجائے دونوں اپنی اپنی استعداد کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ تعاون عمل کر کے تمدن کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔عورت کو بھی وہی انسانی حقوق حاصل ہیں جو مرد کو حاصل ہے لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ہر مذہب نے عورت کو جائز حقوق دئے ہیں، مگر تعلیم کی کمی اور مذہب سے لاتعلقی کے باعث بعض مرداساس معاشرہ عورتوں پر ظلم وجبر کرتا رہا۔چنانچہ جب بھی خواتین نے کچھ لکھنا چاہا تو ان کے موضوعات بھی یہی رہیں۔ابتدا میں خواتین کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب اہل علم ودانش نے قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا، جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں بھی سوائے چند کے (بیسویں صدی کی خواتین) علاوہ کسی اور کا ذکر نہیں ملتا۔تاریخ ادب اردو پر نظر ڈالے تو معلوم ہوگا کہ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں خواتین نے کچھ تخلیق نہ کیا ہو اس کے باوجود ان میں صرف چند کا ذکر تذکروں میں سرسری موجود ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام تک خواتین کا ادب کے میدان میں آنا محال تھا۔تاہم بیسویں صدی کے وسط میں خواتین قلمکاروں نے وہ معرکہ انجام دیا کہ اردو ادب کی تاریخ ان کی شاعری، ناول اور افسانوں کے حوالے کے بغیر لکھنا ممکن نہیں رہا۔

ٹھیک اسی طرح جب ہم جموں وکشمیر کے اردو ادب کی بات کرتے ہیں تو یہاں بھی اردو ادب کی تاریخ پر جتنی کتابیں لکھی گئیں جیسے "کشمیر میں اردو"، "ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب" اور "جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشونما" ان میں کسی بھی خواتین ادبیہ یا شاعرہ کا سرے سے ذکر تک نہیں ہے۔جب کہ لل دید نے بہت پہلے کشمیری زبان میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار شاعری کے ذریعے کیا ہے۔

> "جموں وکشمیر کی پہلی شاعرہ اور پہلی روحانی بزرگ خاتون لل دید چودھویں صدی کی ایک عظیم شخصیت تھیں۔ان کی پیدائش عبدالوہاب شائق نے اپنی منظوم تاریخ کشمیر میں 1334۔35 لکھا ہے۔"

(لل دید: کشمیر کی مشہور معروف شاعرہ، جے لال کول، ترجمہ۔موتی لال ساقی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی 1985، ص16)

لل دید کے بعد حبہ خاتون، ارنی مآل نے بھی کشمیری میں اور روپا بھوانی نے اردو آمیز ہندی میں مرد کے ظلم وستم اور عورت کی بے بسی کا اظہار کیا ہے۔

لیکن جب جموں وکشمیر میں اردو ادب کی بات کرتے ہیں تو اردو کی

پہلی غزل گوشاعرہ زینب بی بی محجوب ہے جن کا نعتیہ مجموعہ " گلبن نعت "میں تقریباً 29 نعتیہ غزلیں ملتی ہیں۔فرید پربتی ان کی انفرادیت کواجاگر کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری عقیدتی شاعری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔
ان کے یہاں جذباتی وفور گداز اور پاکیزگی بدرجہ اتم موجود ہے۔''

(ہماراادب۔جموں وکشمیر معاصر نسائی ادب نمبر، ڈاکٹر گلزاراحمد وانی، ص:153)

زینب بی بی محجوب کے بعد شہزادی کلثوم کا نام آتا ہے۔شہزادی کلثوم نے شاعری کے علاوہ کامیاب مضمون بھی لکھے ہیں جو ملک کے مختلف رسالوں میں تسلسل سے شائع ہوتے رہتے تھے۔ان رسائل میں عصمت، بنات اور خاتون مشرق' قابل ذکر ہیں۔انھیں بابائے جمالیات پروفیسر شکیل الرحمان نے جموں وکشمیر کی پہلی غزل گوقرار دیا ہے۔

(یادگار کلثوم، مرتب اکبر جے پوری 1962، ص:22-25)

ان کے اسلوب کے بارے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

"شہزادی کلثوم اچھی انشاء پردازانہ صلاحیتوں کی مالک تھیں، لیکن ان صلاحیتوں کے شباب پر پہنچنے سے پہلے ہی یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔''

(کشمیر میں اردو (حصہ سوم)، ص108، اکیڈی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر جموں)

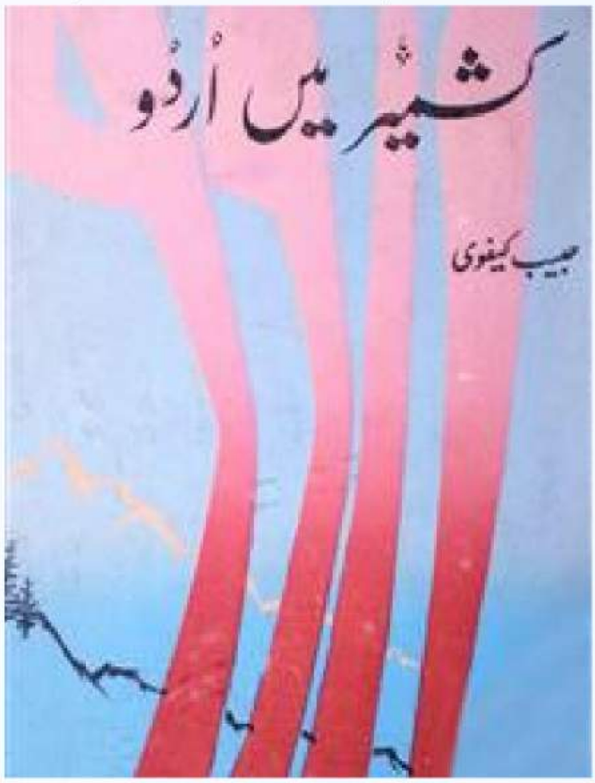

تاہم اردوادب میں خواتین بیسویں صدی کی آخری دہائی میں رواضح ہوکر سامنے آئیں۔جنھوں نے قلم کے ذریعے نہ صرف اپنے جذبات واحساسات، سوچ وفکر اورنسوانی مسائل کو پیش کیا بلکہ فن اورادبی معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات کو خوبصورت انداز میں قاری کے سامنے رکھنے کی کوشش کی۔ان میں عائشہ مستور، رخسانہ جبین، ترنم ریاض، نصرت آراچودھری، سیدہ نسرین نقاش اور شبنم عشائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ پروین راجہ، نرگس ستارہ، نگہت فاروق نظر، سلمیٰ فردوس، روبینہ میر، اطہر ضیاء، نتاشا کول، نگہت صاحبہ، حنا خان اور ڈاکٹر رومانہ بھی شعر کہتی ہیں۔

ان میں جن شاعرات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں ترنم ریاض کا" پرانی کتابوں کی خوشبو"، شبنم عشائی کے مجموعے "دشت تنہائی، روحیں چناب کی، تنہایاں اورلہو پکارتا ہے۔نصرت آراچودھری کا' ہتھیلی کا چاند"، صاحبہ شہریار کے تین مجموعے "شاخ لرزاں، برگ چنار، آگہی کا در "وغیرہ مجموعے ایسی معتبر خواتین کے ہیں جنھوں نے روایتی شاعری کا پاس رکھتے ہوئے جدید تر رجحانات کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ان کے نزدیک آزاد نظم ایسی پسندیدہ صنف رہی جس کے تحت انھوں نے کشمیر کے حالات، عوام پر ہو رہے ظلم وزیادتیاں، حقوق آزادی کے حصول میں انسانوں کا قتل عام، رنج والم، احساسات وجذبات کے علاوہ عورتوں پر ہو رہے ظلم واستحصال وغیرہ جیسے موضوعات کو بڑی بے باکی سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔خاص کر اپنی شاعری کو نسوانی مسائل اور نفسیات کا جامہ پہنایا ہے۔چند مثالے ملاحظہ فرمائیں:

تم کہتے ہو کہ نصف کبھی پورا نہیں ہوسکتا
ذرا آج تم غور سے دیکھو
میرے وجود کو ست رنگی پہلو کو
میں اک چھتنار پیڑ کی مانند
گھنا سایہ اور بھری شاخیں لیے
اپنی جگہ بھرپور ہوں
کہیں ماں ہوں، کہیں بہن
کہیں بیوی تو کہیں بیٹی
ملا کہیں دیوی کا درجہ
کہیں بنی بازار کی رونق
کبھی کسی مجنون کی لیلی
تم ہی کہتے ہو میرے پیروں تلے جنت ہے

کیا
یہ ست رنگی شخصیت لے کر بھی میں
ادھوری ہوں
نصف ہوں
اپنے آپ کو پورا کہنے والے تم کیسے پورا ہو سکتے ہو
(نگہت فاروق نظر، نظم کڑا سچ)
جبکہ تم ایک نصف سے جڑے ہو!!!!

جو بھی چہرے ہیں خون سے تر ہیں
ہر طرف غم زدہ سے پیکر ہیں
روز محشر سے کیا ڈرتے ہو
میرے آنگن میں سارے محشر ہیں
(نصرت آرا چودھری)

روح سے ٹپکے لہو آنکھ سے پانی برسے
میں نے سوچا ہی نہ تھا جاتے ہیں بچے گھر سے
سانجھ کے سایوں کو دیکھا کروں برآمدے میں
اور آتی رہے بچوں کی صدا اندر سے
وہ میری طرح نہ بچوں کے لیے رو دے کہیں
اپنے چہرے پہ سجاتی ہوں ہنسی اس ڈر سے
(ترنم ریاض)

مختصراً یہ کہ کشمیری شاعرات ان نامساعد حالات کے باوجود دنیا کی باقی خواتین کی طرح شعر و ادب میں ایسے اقدامات سرانجام دے رہی ہیں جو بلاشبہ قابل فخر ہیں۔

جموں و کشمیر کی خواتین نے نہ صرف شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا بلکہ نثری ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے جن میں ڈاکٹر ترنم ریاض، نعیمہ مہجور، زنفر کھوکھر، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، ڈاکٹر نگہت نظر، واجدہ تبسم گورکھور، ڈاکٹر ممتاز کوثر، شبنم بنت رشید، تبسم ضیا، میت کور، رافعہ ولی اور رافیعہ رسول مغموم وغیرہ ادباء قابل ذکر ہیں۔ ان کی تحریروں کا انداز اور مزاج ملک کے باقی خطوں/ علاقوں میں لکھی جارہی تحریروں سے مختلف ہے کیونکہ یہاں حالات ہمیشہ دگرگوں رہے ہیں۔ مسلسل رونما ہونے والے ہنگامی واقعات، موت یا گمشدگی، جبر و استحصال، خوف و ہراس جیسے مسائل ان کی کہانیوں میں خاص طور سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

خواتین قلمکاروں میں ترنم ریاض سرفہرست ہیں جو شاعرہ، ناول نگار، افسانہ نگار، تبصرہ نگار اور محقق و نقاد کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ ان کے آٹھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں 'تنگ زمین، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، نرگس کے پھول، صحرا ہماری آنکھوں میں ' کے علاوہ ناولٹ 'مورتی' اور 'برف آشنا پرندے' اہمت کے حامل ہیں جن میں احساسات اور جذبات کے واضح نمونے ملتے ہیں۔

دوسرا اہم نام نعیمہ مہجور کا ہے جو بحیثیت افسانہ نگار پوری دنیا میں مشہور ہوئیں۔ ان کے افسانوں میں " آگ، سیاہ رات کی چاندنی، اس بستی کی رات اور سفید چاندنی کے علاوہ انھوں نے "دہشت زادی" کے نام سے ناول لکھ کر اس صنف میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ انھوں نے جہاں اپنی کہانیوں میں عورت کو مرکزی حیثیت دے کر ان کے سیاسی و سماجی حالات و مسائل کو پیش کیا تو وہیں انھوں نے آج کی تعلیم یافتہ لڑکی کی بے باکی و سرکشی کو بھی اجاگر کیا ہے۔

اسی طرح سیدہ نسرین نقاش بھی کشمیر کی ان قلمکاروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے قلم سے بیک وقت شاعری، افسانہ نگاری اور مضمون نگاری کی ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں متوسط طبقے کو پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے "ادھوری خواہش، اور سلگتی لکیریں" شائع ہو چکے ہیں۔

جن کشمیری خواتین نے اپنی پہچان ادبی دنیا میں بنائی ان میں زنفر کھوکھر کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے کہانی لکھنے کی شروعات اپنی مادری زبان سے کی اور بعد میں اردو کی طرف راغب ہوئیں۔ اردو میں ان کی پہلی کہانی "نصیحت" طنز و مزاح پر مبنی ہے۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں "خوابوں کے اس پار، کانچ کی سلاخ، عبرت اور ہم سب ایک ہیں"۔ ان کے افسانے ''ہند سماچار، شاعر، تریاق' کے علاوہ دیگر رسائل و جرائد میں مسلسل چھپتے رہے۔ ان کی کہانیاں سماج کے مختلف رنگوں کی آئینہ دار کرتی ہیں، موضوعات میں تنوع ہے۔ دہشت گردی، بربریت، سرحدی علاقوں میں فوج، حفاظتی اداروں کی طرف سے بے گناہ اور معصوم لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ، اخوانی وغیرہ جیسے سماجی حالات ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات کے علاوہ عورت کے

مسائل، ذات پات، رشوت خوری، عورتوں کی بےبسی ولاچاری پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ رسالہ 'شاعر' ممبئی نے ان پر خصوصی نمبر بھی نکالا ہے اور افتخار امام صدیقی کے ساتھ ان کا ادبی مکالمہ بھی شائع ہوا ہے۔

جموں و کشمیر کی خواتین قلمکاروں میں ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی بھی ایک

اہم مقام رکھتی ہیں۔ جو فارسی زبان کی پروفیسر بھی رہیں۔ اردو میں ان کے تین افسانوی مجموعے ''چنار کے برفیلے سائے، خاموش آسمان، روزن پہ میرے چاند'' کے علاوہ کشمیری میں "وانجہ وٹھ" شائع ہو چکے ہیں جو یہاں کے مختلف اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کالم نگار بھی ہیں ان کا کالم ''میری دنیا میرے لوگ'' کافی مشہور ہوا جو مسلسل دو سال تک شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے چند کتابیں بھی تخلیق کی ہیں جن میں ''غنی کشمیری، حیات اور شاعری، فارسی کی طرف پہلا قدم، فارسی کی طرف دوسرا قدم، شہر ہای نور سفر نامہ حج'' وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شاعری بھی کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عورت بحیثیت ماں، بہن، بیوی اور سہلی کے رنگ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے معاشی بدحالی، عورت و مرد کے تعلقات، مخصوص تہذیبی تناظر وغیرہ جیسے موضوعات پر کھل لکھا ہے۔

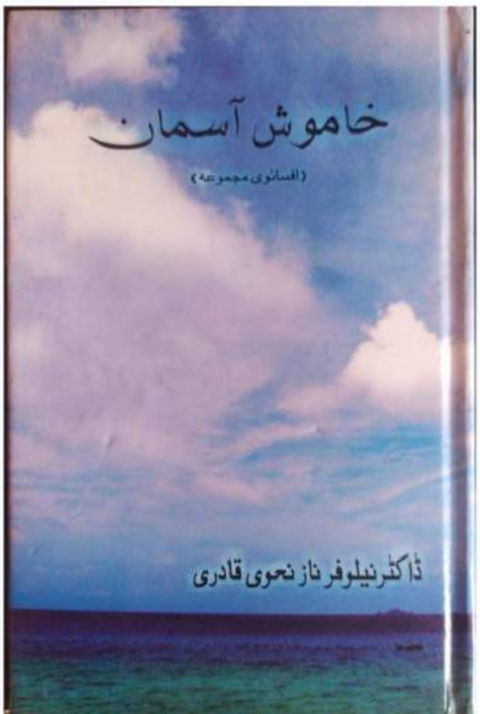

دور حاضر کی خواتین میں سیدہ نگہت نظر بھی ایک اہم نام ہے جو شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "قہر نیلے آسماں کا" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری سے متعلق افسانہ نگار نور شاہ یوں رقمطراز ہیں:

''ریاست جموں و کشمیر میں خواتین اردو قلم کاروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے سیدہ نگہت نظر صاحبہ ابھی ادبی منزل کی تلاش میں ہیں۔ منزل اگر چہ دور ہے لیکن تخلیقی سفر جاری ہے۔ اس تخلیقی سفر کے دوران وہ دوسرے اہم اور بلند پایہ قلم کاروں کی تخلیقات کا مطالعہ بھی کریں۔ مجھے یقین ہے ایسا کرنے سے ان کی سوچوں میں نکھار آئیگا اور ذہن کی راہیں کھل جائیں گی۔''

(ہمارا ادب، ریاست کی معاصر خواتین قلم کار۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ص:119)

ان کے افسانوں میں سماج کی مصیبت زدہ عورت کے جذبات و احساسات، عورت کے مختلف روپ کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں تانیثی رنگ حاوی ہے۔ نسائی نفسیات کی پیش کش اور سماجی ناانصافی کی شکار عورتوں کے لیے صدائے احتجاج ان کی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔

افسانوی ادب میں واجدہ تبسم بھی ایک اہم نام ہے۔ "ڈولتی نیا" کے نام سے ان کا افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے۔ تبسم ضیا کا نام بھی اہمیت کی حامل ہے ان کا افسانوی مجموعہ ''رمق'' 2016' میں شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے سماج کی بے ہودہ رسومات، جہیز جیسی لعنت، عورت کے ساتھ استحصال جیسے مسائل پر لکھا ہے۔ عہد حاضر کے دیگر خواتین قلمکاروں میں شبنم بنت رشید، عذرا بنت گلزار، رافیعہ ولی، میت کور، زبیدہ گلزار، بلقیس مظفر اور شمیمہ صدیقی قابل ذکر ہیں۔

بحیثیت مجموعی کشمیر کی خواتین قلم کاروں نے اپنے گرد و پیش، اپنے مادر وطن کی تہذیب و ثقافت، عوام پر ہو رہے ظلم و استحصال کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ان خواتین کے یہاں تانیثی فکر نظر آتی ہے۔ انھوں نے عورت کے مسائل، ان پر ہو رہے ظلم و استحصال، عورتوں کے جائز حقوق نہ ملنے کے خلاف جو غم و غصہ اور آواز بلند کی وہ نہ مغربی خواتین کی تانیثی تحریک کی طرح جارحیت مزاحمت ہے اور اور نہ ہی یہ خواتین مرد کے وجود کے انکار کے منفی رجحان سے متاثر ہیں بلکہ مرد کو اپنا محافظ جانتی اور مانتی ہیں۔ بقول اقبال:

نہ پردہ ، نہ تعلیم ، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوز رد

Rohee Jan
Research Scholar, Dept. of Urdu
Kashmir University
Shopian-192303 (J & K)
Mob: 7780844007

رینو بہل

اُلفت کے تقاضے

آمنہ کے کہے ہوئے الفاظ دِل کو چبھے ضرور تھے مگر اُن لفظوں کی گہرائی میں کتنا کرب، کتنا درد تھا یہ میں محسوس کرسکتی تھی کیونکہ اُس کی زندگی میرے لیے کھلی کتاب تھی۔ آج تک میں نے کسی عورت سے ایسی بات نہیں سنی تھی جو اُس نے روتے روتے کہہ دی — اپنے دل کے زخم دکھاتے ہوئے اچانک کہہ اُٹھی:

"بھابھی آپ بڑی خوش قسمت ہیں کہ آپ بیوہ ہیں۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی:

"عزت دار بیوہ ہیں، اس لیے کہا۔ آپ نہیں سمجھ سکتیں ایک بے وفا شوہر کی بیوی ہونا اور پھر طلاق شدہ ہو جانا کتنا بڑا عذاب ہے۔ میں نے ساری زندگی محبت کے جن لمحوں کو سنجو کر یادوں کی پٹاری میں سنبھال سنبھال کر رکھا تھا، وہ یہی اب کرچی کرچی ہو کر میرے وجود کو زخمی کر رہے ہیں۔ جن لمحوں پر مجھے غرور تھا آج میں انہیں اپنے ذہن سے کھرچ کھرچ کر نکال دینا چاہتی ہوں۔ زہریلے سانپ سے بھی زیادہ زہر ہے ان میں۔"

میرے پاس اُسے تسلّی دینے کے لیے بھی الفاظ نہیں تھے۔ وہ آنسو بہاتی رہی اور میں اُس کے کاندھے، اس کی پشت کو سہلاتی رہی۔

کہہ تو وہ ٹھیک رہی تھی۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسے شوہر کا ساتھ ملا جس نے اپنی رفاقت، اپنی بے لوث محبت سے میری زندگی میں خوش نما رنگ بھر دیئے۔ میری ہر ضرورت پوری کی، میری ہر خواہش کا احترام کیا، میرے کہنے سے پہلے میری فرمائش پوری کی۔ اپنے خود کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ ان کی ہر خواہش، ہر خوشی اُن کے گھر پریوار تک آ کر سمٹ جاتی۔ دو پھول سے بچوں کا تحفہ دیا۔ مجھے ماں بننے کا اعجاز بخشا۔ ان کے دم سے گھر میں میری زندگی میں بہار ہی بہار تھی۔ پھر اچانک بہار کا موسم گزر گیا اور خزاں نے مستقل طور پر میری زندگی پر قبضہ کر لیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ٹوٹ کر بکھر جاتی، اگر میرے دونوں بچے اور میرے ہمسایہ ڈھال کی طرح میرے پیچھے نہ کھڑے ہوتے۔ مجھے گرنے سے، بکھرنے سے ان سب کی محبتوں نے بچا لیا۔ خود کو سنبھالا تو احساس ہوا کہ 'سنجے' جا کر بھی کہیں نہیں گئے۔ وہ تو میرے وجود، میری سانسوں، گھر کے کونے کونے میں بسے ہوئے ہیں۔ ان کی محبت اتنی مضبوط تھی کہ ان کے جانے کے بعد بھی محبت کا وہ رَس میری رگوں میں سرایت کرتا رہتا۔ ان کی کہیں چھوٹی چھوٹی، میٹھی میٹھی باتیں میرے کانوں میں رَس گھولتی رہتیں۔ جسمانی طور پر میں انہیں چھو نہیں سکتی تھی مگر اپنے قریب ہمیشہ محسوس کرتی رہی۔ یہ احساس اُن کی وفاؤں اور محبت سے میرے اندر پیدا ہوا تھا، جس نے میری زندگی میں آسانیاں پیدا کر دی تھیں اور آمنہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کہ میں بیوہ ہو کر بھی اُس سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔

اختر صاحب ہمارے پڑوسی ہی نہیں بلکہ میرے بڑے بھائی جیسے ہیں۔ دونوں گھروں میں بڑے دیرینہ اور اچھے مراسم ہیں۔ جب میں یہاں بیاہ کر آئی تھی تو اشرف اٹھ سال کا اور عمران سات سال کا رہا ہوگا۔ میرے آگے پیچھے بھابھی بھابھی کہہ کر پھرا کرتے تھے۔ شبنم بھابھی اکثر ڈانٹا کرتی کہ کیوں 'دلہن' کو سارا دن پریشان کرتے ہو۔ مگر وہ کہاں کسی کی سننے والے تھے۔ موقع ملتے ہی دیوار پھلانگ کر آجاتے۔ میری ساسوماں بھی دونوں سے بڑا لاڈ چاؤ کرتی تھیں، البتہ سنجے سے تھوڑا دبتے تھے۔ ان کی شخصیت ہی ایسی تھی، باہر سے اخروٹ جیسے سخت مگر اندر سے نرم۔ لاڈ بھی کرتے اور سختی بھی دکھاتے۔ میرے دونوں بچے بھی شبنم بھابھی کی نگرانی میں پلے۔ ابھی سمرتھ دو مہینے کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی دادی دِل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے چل بسی۔ میری پہلی اولاد تھی۔ مجھے بچے کہاں سنبھالنے آتے تھے۔ تب شبنم بھابھی نے ہی سب سنبھالا تھا۔ بڑی بہن کا مجھے سہارا دیا۔

گرم سرد موسم چلتے رہے مگر دونوں خاندانوں کے رشتوں کی گرماہٹ برقرار رہی۔ نندنی کی پیدائش پر دونوں گھروں میں خوشیوں کے شادیانے بجے تھے۔ اشرف اور عمران کی بھی وہ ہمیشہ چھوٹی لاڈلی بہن ہی رہی۔ دونوں گھروں کی سانجھی بٹیا تھی۔ اس کی شادی پر کہنا مشکل تھا کہ اس کا مائیکہ کون سا ہے۔

شبنم بھابھی چل بسی تو اشرف کی بیوی گھر میں آگئی۔ ادھر نندنی کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت کیا تو اُدھر سنجے نے دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ پرانے رشتے بچھڑنے لگے تو نئے رشتے جڑنے لگے۔

آمنہ اختر صاحب کے چھوٹے بھائی کی بیٹی تھی۔ اس کا اکثر گھر میں آنا جانا لگا رہتا۔ اشرف کی بیگم کو اس کا اس طرح آنا پسند نہیں تھا مگر عمران اور آمنہ کے بیچ محبت کا رشتہ جو شاید بچپن سے ہی پنپ رہا تھا، وقت کے ساتھ مضبوط ہوتا گیا۔

عمران اکثر آ کر آمنہ کی باتیں سناتا رہتا ہر کوئی اس کی کیفیت سے باخبر تھا۔ اختر صاحب نے بھائی سے ایک روز اُسے اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا اور آمنہ دلہن بن کر گھر میں آگئی۔ پرانے جو رشتے اشرف کی بیگم کے آجانے سے سرد پڑ گئے تھے وہ پھر سے گرمانے لگے، آمنہ کے آجانے سے گھر میں رونق آگئی۔ خوبصورت، خوش طبیعت، خوش اخلاق اور بڑی انکساری سے سب سے ملتی۔ اشرف کی بیگم کو بھی اس نے اپنے خلوص سے کافی حد تک نرم کر لیا تھا۔ جب کبھی فرصت ملتی، میرے پاس دوڑی چلی آتی۔ دل کی ہر بات بے جھجک کر لیتی۔ اس کی والدہ اس کے بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔ اس لیے جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو مشورہ کرنے آجاتی۔

پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، بچوں کی پیدائش، ان کی پرورش اور گھر کے کاموں میں اُلجھی رہتی۔ آٹھ سالوں میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں بن گئی تو ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ مگر بدلتے حالات کے ساتھ ملنے کی فرصت تو کم ملتی پر قربتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نندنی اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا میں جا کر بس گئی تو سمرتھ کو نوکری کے سلسلے میں بنگلور جانا پڑا۔ کچھ روز میں بھی اس کے پاس رہ کر آئی مگر میرا وہاں اکیلے انجان شہر کے انجان لوگوں میں بالکل دل نہیں لگا۔ کچھ ہی دنوں میں واپس اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئی۔ گھر میں بے شک اکیلی تھی مگر یہاں میرے اِردگرد میرے اپنے لوگ تھے جو ایک آواز کی دوری پر تھے اور اُن سب کے پاس ہوتے مجھے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا۔ گھر کے دروازے کھلے رہتے اور آس پڑوس سے ملنے والے بنا دروازہ کھٹکھٹائے چلے آتے۔

سمرتھ کی شادی کے دوران میں نے محسوس کیا کہ آمنہ کے چہرے پر شوخی اور خوشیوں کی رنگ کچھ پھیکے پڑ گئے ہیں۔ میرے ہر کام میں اس نے بھاگ بھاگ کر مدد کی مگر اس کے وجود میں کہیں کوئی درد، کوئی غم ٹھہر سا گیا تھا جیسے وہ سب سے چھپانا چاہتی تھی۔

شادی کے ہنگاموں سے فرصت ملتے ہی جب نندنی بھی واپس لوٹ گئی اور سمرتھ بھی دلہن کو لے کر بنگلور چلا گیا تو میں نے ایک روز آمنہ کو بلا بھیجا کیونکہ کئی روز سے میں اُس کی اُداسی کا سبب جاننا چاہتی تھی، جو مجھے پریشان کر رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں سیدھے مدعے پر آئی۔

''کیا پریشانی ہے تمھیں؟''

''مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تمھیں آج سے نہیں تمھارے بچپن سے تمھیں جانتی ہوں۔ مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟ بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' جیسے ہی میں نے اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تو وہ سراج کی مانند پگھل گئی۔ آنکھیں زاروقطار بہنے لگیں۔ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

''اس طرح مت روؤ آمنہ۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے، میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔''

''بھابھی، عمران اب وہ عمران نہیں رہا۔ بدل گیا ہے۔''

''بدل گیا ہے؟ کیسے؟ یہ تمھارا وہم ہے، زندگی کی بھاگ دوڑ نے اُسے پریشان کر رکھا ہوگا۔ آج کے دور میں تین بچوں کو پالنا کون سا آسان

ہے۔ تمھیں ضرور وہم ہوا ہوگا، وہ ایسا نہیں ہے۔''

''میں بھی یہی سوچتی تھی پہلے مگر ایسا کچھ نہیں۔ بیوی ہوں اُن کی، مجھ میں اَب اُن کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔''

''میں نہیں مانتی۔ وہ تو تمھیں بچپن سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ ایسے کیسے کر سکتا ہے؟''

"میں بھی اسی غلط فہمی کی شکار تھی بھابھی، مگر اب وہ بدل چکا ہے۔ کئی بار میں نے اُس کے قریب جانے کی کوشش کی، تھک ہار کر جب رات کو اس کی بانھو ںمیں جاتی تھی اور سینے پر سر رکھ کر سو جاتی تھی تو میرے سارے دن کی تھکن منٹوں میں دور ہو جاتی تھی۔ مگر اب وہ میری طرف پشت کر کے لیٹ جاتا ہے۔ میں اُس کی پشت سے بھی لپٹنا چاھوں تو کروٹیں بدل کر خود سے دور کر دیتا ہے۔"

''میں بھی اسی غلط فہمی کی شکار تھی بھابھی، مگر اب وہ بدل چکا ہے۔ کئی بار میں نے اُس کے قریب جانے کی کوشش کی، تھک ہار کر جب رات کو اس کی بانہوں میں جاتی تھی اور سینے پر سر رکھ کر سو جاتی تھی تو میرے سارے دِن کی تھکن منٹوں میں دور ہو جاتی تھی۔ مگر اب وہ میری طرف پشت کر کے لیٹ جاتا ہے۔ میں اُس کی پشت سے بھی لپٹنا چاہوں تو کروٹیں بدل کر خود سے دور کر دیتا ہے۔''

''تم بیوی ہو اُس کی، تم نے پوچھا نہیں، وہ اس طرح کیوں کر رہا ہے؟''

''پوچھا تھا۔ کہنے لگا سارا دن کام کر کے ذہنی اور جسمانی طور سے تھک جاتا ہوں، آرام چاہیے۔ اب ساری عمر ایسے تو نہیں چل سکتا۔ میں شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ اس کے جواب نے مجھے خود کی نظروں میں گرا دیا۔ اُس دن کے بعد میں نے فاصلہ رکھنا شروع کر دیا۔ اب ایک سرد سا فاصلہ ہم دونوں کے درمیان حائل ہو چکا ہے۔''

''تم کہو تو میں بات کروں؟''

''نہیں بھابھی — اُسے اچھا نہیں لگے گا۔ سمجھے گا میں نے آپ سے شکایت کی۔''

''تم صبر اور حوصلے سے کام لینا، دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آپ بس میرے لیے دُعا کرنا۔''

پھر وہ دیر تک بچوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی اور جب گھر جانے لگی تو وہ پُرسکون نظر آئی۔ دل کا بوجھ بانٹ لینے سے کم ضرور ہو جاتا ہے۔

بچے کھیلتے کودتے میرے پاس آ جاتے۔ کبھی آمنہ لینے آ جاتی تو کبھی عمران بھی ملنے آ جاتا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب عمران بھی خاموش خاموش رہنے لگا ہے۔ مجھ سے نظریں چراتا ہے، جس طرح پہلے ہنسی مذاق، شرارتیں کرتا تھا اب وہ کافی سنجیدہ رہنے لگا ہے۔ میں نے ہنس کر باتوں باتوں میں وجہ پوچھی تو مسکرا کر ٹال گیا۔ مگر اس کے رویے سے میرے دل میں کھٹکا ضرور ہوا۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے۔ تجربہ کہہ رہا تھا کہ طوفان آنے والا ہے اور آ کر ہی رہے گا۔

ایک روز سمرتھ کا فون آیا کہ بہو کی طبیعت خراب ہو گئی ہے، اور مجھے جلدی اس کے پاس بنگلور پہنچنا چاہیے۔ اشرف نے میری ٹکٹ بُک کرائی اور خود مجھے فلائٹ میں بٹھا کر آیا۔ بہو کو ساتواں مہینہ چل رہا تھا۔ ادھر اچانک طبیعت بگڑ جانے کی وجہ سے سب پریشان ہو گئے تھے۔ میں اپنی اس پریشانی میں باقی سب پریشانیاں بھول گئی۔ بہو کے Premature بیٹا ہوا تھا۔ جس وجہ سے اُسے بیس دن اسپتال میں ہی علاج کے لیے رکھا گیا۔ خوشی کی خبر ہوتے ہوئے بھی ہم خوشیاں محسوس نہیں کر پائے۔ جب تک ماں بیٹا خیریت سے گھر نہیں آ گئے۔ بچے کے ساتھ کیسے چھ مہینے گزرے پتا ہی نہیں چلا۔ اس کے آ جانے سے زندگی میں نئی تازگی اور جسم میں توانائی کی جو لہر میں نے محسوس کی، بتا نہیں سکتی۔ اُسے چھوڑ کر واپس آنے کو جی تو نہیں تھا مگر پیچھے گھر کے کچھ کام ایسے تھے جس وجہ سے مجھے لوٹنا پڑا۔

چھ مہینے بعد گھر لوٹ کر آئی تو یہاں سب کچھ بدل چکا تھا۔ اشرف بھائی پہلے سے زیادہ ضعیف اور عمر سے زیادہ بزرگ لگنے لگے تھے۔ اشرف کی بیگم کے تیور ساتویں آسمان پر تھے۔ آمنہ خزاں رسیدہ پھول کی طرح زرد اور بکھری بکھری نظر آئی۔ بچوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے اور عمران گھر چھوڑ کر نیا گھر بسانے جا چکا تھا۔

یہ سب سن کر مجھے کبھی یقین نہ آتا مگر سب کے بدلے ہوئے حال اور بکھرا شیرازہ چیخ چیخ کر سب کہہ رہا تھا۔

بڑی ہمت جٹا کر اُن کے گھر گئی تو اختر بھائی کی شکست خوردہ حالت دیکھ کر دل رو پڑا۔ کچھ پوچھنے اور کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ میری

کیفیت اُن سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ خود ہی کہہ اُٹھے:

''گیتا بہن، میں ہار گیا اپنی زندگی سے، اپنی اولاد سے۔ سوچا نہ تھا کبھی اتنا مجبور اور کمزور بھی ہوسکتا ہوں۔ میں آمنہ کا گھر بچا نہ سکا۔''

''آپ خود کو قصوروار کیوں سمجھتے ہیں۔ کون ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد کا گھر اُجڑ جائے۔''

''میں اب اپنے مرحوم بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ میری تو آخرت بھی میری اولاد نے خراب کر دی۔''

''آمنہ کدھر ہے؟''

''اپنے کمرے میں ہی ہوگی۔ اس بے چاری کے پاس کون سا دوسرا ٹھکانہ ہے؟''

''میں اُس سے مل کر آئی۔'' یہ کہہ کر میں اُٹھ کر اُس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

مجھے دیکھتے ہی آمنہ مجھ سے لپٹ کر ایسے روئی جیسے بیٹی ننگے پاؤں کانٹوں بھرے راستے پر چل کر ملائم گھاس کی پناہ میں آئی ہو۔

جس وقت میں بنگلور گئی تھی، اُس وقت اُن دونوں کے رشتوں کے بیچ شک آچکا تھا۔ عمران کے بدلتے رنگ نے اور اِدھر اُدھر اُڑتی آئی سرگوشیوں نے اسے وسوسوں میں ڈال دیا تھا۔ شک کا کیڑا کلبلا کر زبان تک آ گیا تو عمران پہلے اُسے اس کا خلل، پھر وہم، پھر انکار کہہ کر ٹالتا رہا۔ آخر میں تنگ آ کر خود ہی اقرار کر لیا اور فیصلہ سنا دیا کہ وہ اُس لڑکی سے نکاح کر رہا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی گھر میں طوفان آ گیا۔ آمنہ نے پیار و محبت کے وعدے یاد کرائے، بچوں کا واسطہ دیا، باپ نے عاق کرنے کی دھمکی دی، مگر وہ اپنے فیصلے سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ سال بھر پرانی محبت کے آگے بچپن کی محبت دم توڑ گئی۔ آمنہ نے عمران کو شادی کی اجازت نہیں دی اور اُس نے طلاق دے کر اپنی خواہش پوری کر لی۔ آمنہ کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ بچوں کو لے کر اپنے تایا کے گھر میں ٹکی رہے، مگر اس کے اندر ایک جوالا مکھی دھدھک رہا تھا۔ اس نے اپنی ہار کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنا لیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصّے کے رنگ دیکھ کر میں چونک گئی۔ یہ آنے والے طوفان کا اشارہ تھا۔ طوفان ابھی تھما نہیں ہے، ابھی نہ جانے کتنی تباہی باقی ہے۔

میں نے آمنہ کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''دیکھ آمنہ، اپنے بچوں کی طرف دیکھ کتنے سہمے ہوئے ہیں۔ اب تمھیں ان کے لیے جینا ہے۔ ان کو دیکھنا ہے۔''

''کیوں بھابھی؟ کیا یہ صرف میری اولاد ہیں، کیا یہ صرف میری ذمہ داری ہیں؟''

''ذمہ داری تو دونوں کی ہے۔ اگر ایک نہ سمجھے تو دوسرے کو تو سمجھنا ہوگا۔ اس میں معصوم بچوں کا کیا قصور؟''

''قصور تو میرا بھی نہیں، مگر جس کا قصور ہے اُسے سزا ضرور ملے گی اور سزا میں ہی دوں گی۔''

''کیا کرو گی؟''

''کر کے بتاؤں گی۔ آپ کے سامنے ہوگا سب کچھ۔ جس کی خاطر اس نے مجھے چھوڑا، دیکھنا کیسے بھاگتی ہے اُسے چھوڑ کر۔''

''آمنہ مجھے تمھارے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا۔ کہیں ایسا نہ ہو اس سے بھی بڑا نقصان کر بیٹھو۔''

''اب فائدے نقصان کا وقت گیا بھابھی۔ اب تو فیصلہ ہوگا۔''

اس کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے دہک رہے تھے۔ اس سے پہلے میں نے آمنہ کا یہ روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ محبت میں چوٹ کھائی عورت، زخمی ناگن سے کم نہیں ہوتی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ انتقام کہیں اس کے بچوں کو بھی نہ نگل لے۔ غصّہ انسان کی عقل، اس کے شعور پر پتھر ڈال دیتا ہے اور ہوش تو تب آتا ہے جب سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔

نہ تو وہ کوئی بات سننے کے موڈ میں تھی، نہ سمجھنے کے۔ بچے مرجھائے پھولوں کی طرح سہمے سہمے ماں کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ محبت اور نفرت کی جنگ میں یہ بے گناہ معصوم بچے کیوں پس رہے ہیں؟ ان کا کیا قصور ہے؟ خدا کرے ان کے والدین کو عقل آ جائے اور یہ پھول ٹوٹ کر بکھرنے سے بچ جائیں۔ دل میں دُعا کرتے میں وہاں سے آ گئی۔

دوسری شام ہی خبر ملی کہ آمنہ نے انتقام لے لیا۔ وہ گھر چھوڑ کر بچے چھوڑ کر یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ اپنے خالہ زاد کے دیور کے ساتھ نکاح کر رہی ہے۔ بچے عمران کی ذمّہ داری ہیں، وہ انھیں سنبھالے۔ عمران سر پکڑ کر بیٹھا ہے۔ نئی بیگم تین بچوں کی ماں بننے کو تیار نہیں۔ بڑے بھائی بھابھی نے ہاتھ کھڑے کر دئے۔ ماں باپ کے ہوتے بچے یتیم ہو گئے۔ میں سمجھ نہیں پا رہی کہ یہ انتقام کیسا تھا؟ کس نے کس سے لیا؟ محبت، نفرت اور اَنا کی جنگ میں معصوم بچے شہید ہو گئے۔

●●●

Renu Behl
#1505
Pushpac compkex
Sector 49B
Chandigarh-160047 (Haryana)
9781557700

بس تم کو چاہا ہے

رومانہ عفّت راہی

سورج اپنی سنہری کرنیں سمیٹنے لگا تھا۔موسم سرما کی دلفریب سی شام ہر طرف چھانے لگی تھی ۔ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے چل رہے تھے ،افق پہ کئی خوبصورت سے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ابھی ابھی آفس سے لوٹا تھا اور فریش ہونے کے بعد اپنے ہاتھ میں کافی کا مگ لیے" آفندی ولا" کی سیکنڈ فلور والی، اپنے روم کی بالکونی میں چلا آیا۔۔۔افق پہ اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتے دیکھتے ایک دم اس کی نگاہیں" آفندی ولا" کے لان میں ٹھہر گئی ۔شافع سکندر کافی کے سپ لیتے ہوئے بہت دلچسپی سے اس منظر کو دیکھنے لگا۔

''آفندی ولا'' کے لان میں لگا ہوا امرود کا پیڑ بہت بڑا تھا جس کی ٹہنیاں باؤنڈری وال پہ جھکی ہوئی تھی۔۔۔

اریحہ آفندی،" آفندی ولا" کے لان کی وال پہ چڑھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں امرود کی ایک موٹی سی ٹہنی تھی جس پہ امرود لگے ہوئے تھے، وہ امرود توڑ توڑ کے نیچے گھاس پہ پھینک رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے دوست اسے ٹوکری میں جمع کر رہے تھے۔۔۔۔ پھر وہ موٹی سی شاخ کو پکڑتے ہوئے بندر کی طرح پیڑ پہ چڑھ گئی اور وہاں سے پیلے پیلے امرود نیچے پھینکنے لگی۔۔۔۔ٹہنیوں کو سائیڈ میں کرتے ہوئے اس کی نگاہیں بالکونی میں کھڑے ہوئے شافع سکندر پہ گئی جو کافی فرصت اور دلچسپی سے اس کی بندروں والی حرکت انجوائے کر رہا تھا۔۔۔۔۔اریحہ آفندی کو اایک دم شرمندگی نے آ گھیرا۔۔۔وہ بھی کیا سوچتا ہوگا کہ اتنی بڑی ہو کہ بھی بچوں والی حرکتیں کرتی ہے۔۔۔۔ وہ خفت زدہ سی پیڑ سے اتری اور چھوٹی سی وال پہ کھڑے ہو کے ایک نظر اسے دیکھا، جو ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اتنے فاصلے کے باوجود بھی شافع کے خوبصورت چہرے کی مسکراہٹ اس سے پوشیدہ نہ رہی۔۔۔اریحہ نے جیسے ہی وال پہ سے اترنے کے لیے چیئر پہ پیر رکھنا چاہا تو گھبراہٹ اور شرمندگی کے مارے چیئر کی بجائے سائڈ میں پیر رکھ دیا اور پھر وال سے دھڑام سے گھاس پہ گر پڑی۔۔۔۔۔ شافع سکندر کا قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔۔۔اریحہ کی ٹیم اس کی مدد کے لیے آگے بڑھی اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

"فرینڈ! آپ ٹھیک تو ہو نا۔"۔۔۔؟ اُس کی ننھی دوست اسوہ نے پریشانی سے اسے دیکھا تھا جب کہ اریحہ آفندی نے حیرانگی سے اس اکڑو شخص کو دیکھا جو آج ہنس رہا تھا۔

"اریحہ آپی! آپ کو چوٹ تو نہیں آئی ہے نا"۔۔۔۔۔؟ اریبہ فکرمندی سے بولی۔

"نو۔۔۔۔آئی ایم آل رائٹ"۔۔۔۔اریحہ ایک دم اٹھی تھی اور جلدی سے اندر کی طرف اپنے قدم بڑھا دیے تھے۔۔۔اس وقت اسے

اپنی پوزیشن بہت آکورڈ لگ رہی تھی۔۔۔اس کے ننھے دوست ٹوکری اٹھائے اس کے پیچھے بھاگے تھے، جبکہ شافع سکندر ابھی بھی مسکرا رہا تھا اور ہمیشہ اس کے مسکرانے کی وجہ بنتی تھی وہ پیاری سی نٹ کھٹ، شوخ و چنچل، شرارتی سی لڑکی، جو ہر وقت کالونی کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ مل کر ہنگامہ مچاتی رہتی تھی۔

ابصار آفندی اور زُلیخا آفندی کی چار اولادیں تھی۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔۔۔ بیٹی شادی کے بعد اپنے ہزبینڈ کے ساتھ لندن چلی گئی تھی۔۔شافع سکندر، ناعمہ اور شاہ زیب سکندر کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھا۔۔اس کے ممی، پاپا اپنی اپنی جاب پہ چلے جاتے اور وہ اپنی پڑھائی میں لگا رہتا تھا۔ان کے گھر میں ان تینوں کے سوا کوئی نہ تھا، اس لیے وہ بچپن سے ہی تنہائی پسند اور کم گو سا ہو گیا تھا۔۔اسے شور شرابہ اور ہلا گھلا سے بہت چڑ سی تھی۔۔۔وہ جلدی کسی سے بھی فری نہیں ہو پاتا تھا اسی لیے اسے سب پراؤڈی کہتے تھے، وہ بے تحاشہ ہینڈسم اور اسمارٹ تھا، اس کی بھوری روشن آنکھیں اور براؤن بال اسے سب میں ممتاز کرتے تھے۔۔ناعمہ اور شاہ زیب سکندر کی حادثاتی موت کے بعد وہ لندن میں بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔ابصار آفندی (نانو) کے بے حد اصرار پہ وہ ہمیشہ کے لیے انڈیا میں پچھلے تین سال پہلے "آفندی ولا" میں آ گیا تھا۔اس نے M.B.A کیا ہوا تھا اور پوزیشن ہولڈر تھا اسی لیے اسے ایک شاندار جاب مل گئی تھی۔۔۔وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والا لڑکا، جو بچپن میں بھی بہت کم انڈیا آتا تھا، کیونکہ اپنے نانو کے گھر "آفندی ولا" میں بہت سارے لوگ رہتے تھے۔ تینوں ماموں، ان کی وائف اور بچے۔۔"آفندی ولا" میں ہر وقت قہقہے، شور شرابا اور محفلیں جمی رہتی تھی۔۔۔قسمت بھی کتنا عجیب سا کھیل کھیلتی ہے نا انسان کے ساتھ کہ وہ جو محفلوں سے دور بھاگتا تھا آج قسمت اسے انہی محفلوں میں لے آئی تھی۔۔۔۔اسے بہت ٹائم لگا تو اس ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے میں۔۔آہستہ آہستہ وہ "آفندی ولا" کے ممبرز سے کلوز ہو پایا تھا، اس میں بھی "آفندی ولا" کے ممبرز کا ہاتھ تھا جنھوں نے اسے اپنی محبتوں اور خلوص سے اپنا اسیر کر لیا تھا۔۔۔وہ ان کی محفلوں میں بیٹھتا تو تھا مگر خاموشی سے، مسکراتے ہوئے ان کی نوک جھونک کو انجوائے کرتا تھا۔۔۔۔پھر وقت کچھ اور آگے سرکا، وقت کے ساتھ ساتھ سب بدل جاتا ہے، "آفندی ولا" میں بھی تبدیلی آئی تھی، بڑے ماموں اپنی فیملی سمیت اپنے بزنس کی وجہ سے امریکہ میں سیٹل ہو گئے تھے جبکہ چھوٹے ماموں اپنے بچوں کی پڑھائی کی وجہ سے دہلی شفٹ ہو گئے تھے اور ساتھ میں زلیخا آفندی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔۔زلیخا آفندی اپنے لاڈلے بیٹے کے ساتھ دہلی تو شفٹ ہو گئی تھی مگر وہ "آفندی ولا" کے جلدی جلدی چکر لگاتی تھی۔۔۔۔جبکہ منجھلے ماموں "آفندی ولا" میں ہی تھے اور ان کی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور اب ان کی لاڈلی بیٹی اریحہ آفندی تھی جو ابھی ابھی گریجویشن کے ایگزام سے فارغ ہوئی تھی۔۔۔ "آفندی ولا" کے ممبرز پنچھیوں کی طرف اپنے اپنے آشیانوں کی تلاش میں اڑ گئے تھے۔۔۔۔۔پنچھیوں کے اڑنے کے بعد کیسی اداسی اور ویرانی چھا جاتی ہے۔۔۔۔ناوہ چہچہاہٹیں ہوتی ہے، نا ان کی میٹھی آوازیں۔۔۔۔ اسی طرح "آفندی ولا" میں بھی خاموشی نے اپنا ڈیرا جما لیا تھا لیکن اریحہ آفندی جو بلا کی نٹ کھٹ اور شرارتی تھی، اس کی شرارتوں سے "آفندی ولا" کے در و دیوار مسکراتے تھے۔۔اُس بولتی مینا کی کھلکھلاہٹوں سے "آفندی ولا" میں ساز بجتے تھے، وہ "آفندی ولا" والوں کی جان تھی۔۔۔ ہر وقت نئی شرارت کی تاک میں رہتی تھی۔۔۔لیکن وہ شرارتی سی لڑکی ڈیسینٹ اور پراوڈی سے شافع سکندر کے سامنے بالکل شریف بن جاتی تھی، کیونکہ جب وہ "آفندی ولا" آیا تو شروع شروع میں وہ بھی اریحہ کی شرارتوں کا نشانہ بنا تھا لیکن اپنی ریزرو طبیعت کی وجہ سے وہ اسے اس کی شرارتوں پہ کئی بار ڈانٹ چکا تھا، اسی لیے اس بولتی مینا کی بولتی شافع سکندر کے سامنے بند ہو جاتی تھی۔۔۔اریحہ کو پتہ چل چکا تھا کہ شافع ریزرو طبیعت کا مالک ہے اس لیے وہ شافع کے سامنے کوئی بھی شرارت کرنے سے باز رہنے کی کوشش کرتی تھی لیکن ہر بار شافع کے سامنے کچھ الٹا ہو جاتا تھا اور وہ شرمندگی کی وجہ سے کئی دن تک اس سے چھپے پھرتی تھی لیکن اب وقت کے ساتھ ساتھ شافع سکندر جیسا پراوڈی سا شخص بھی اس کی ان اوٹ پٹانگ شرارتوں کی وجہ سے مسکرانا سیکھ گیا تھا۔۔

جنوری کے اوائل دن تھے۔موسم سرما اپنے پورے شباب پر تھا۔ آج ویک اینڈ تھا اس لیے وہ آج لیٹ اٹھا تھا اور بریک فاسٹ کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں صوفے پہ بیٹھا نیوز پیپر کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ہیلو مسٹر اسمارٹ!۔۔۔۔ہاؤ آر یو"۔۔۔۔۔؟ مزنہ اس کے بازو میں صوفے پہ آ کر بیٹھ گئی۔شافع نے نیوز پیپر سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔مزنہ خان، ابصار آفندی کے دوست کی پوتی تھی جو کہ ان کے پڑوسی تھے۔۔۔

"ہائے!۔۔۔اینڈ آئی ایم فائن"۔۔۔۔۔شافع نے ناگواری سے جواب دیا۔

"آج ویک اینڈ ہے تو آج آپ فری ہوں گے"۔۔۔؟

مزنہ نے اپنے اسٹیپ کٹ بالوں کی گولڈن لٹی کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے

کہا۔
"یس۔۔۔۔ بٹ وائے"۔۔۔۔؟ شافع نے اپنی ایک ابرو اُچکاتے ہوئے کہا۔
"مجھے پتہ تھا کہ آج آپ فری ہوں گے، اس لیے میں آپ کے ساتھ شاپنگ پہ جانے کے لیے آئی ہوں"۔۔۔ وہ اسے نہارتے ہوئے بولی تو شافع نے اس کے میک اپ زدہ چہرے کو دیکھا۔۔۔ نیوی بلو جینز پہ وائٹ شارٹ ٹاپ پہنے ہوئے تھی اور گلے میں چھوٹا سا اسکارف جھول رہا تھا۔۔۔ میچنگ سائیڈ بیگ اور قیمتی واچ پہنے وہ پوری تیاری سے آئی تھی، جیسے شافع اس جیسی بے باک اور بولڈ لڑکی کے ساتھ سچ مچ چلا ہی جائے گا۔۔۔ جب سے شافع "آفندی ولا" آیا تھا تب سے مزنہ خان اس کے پیچھے پڑ گئی تھی، وہ بہانے بہانے سے "آفندی ولا" کے چکّر لگاتی تھی جبکہ شافع کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔۔۔ وہ کئی بار اس کی اچھی خاصی انسلٹ کر چکا تھا پھر بھی وہ ڈھیٹ بنی ہر بار اس کی راہوں میں آجاتی تھی۔۔۔ لندن جیسے شہر میں بھی لڑکیاں اس اکڑو پہ مرتی تھی لیکن وہ ان سے دور بھاگتا تھا۔۔۔
"میں اجنبی لوگوں کے ساتھ شاپنگ پہ نہیں جاتا اور گرلز کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔۔" شافع نے کافی درشتگی سے کہا۔
"ہم اجنبی کہاں ہیں ہم تو"۔۔۔۔مزنہ پیار بھرے لہجے میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ گئی۔
"جسٹ شٹ اپ! اس سے آگے ایک لفظ مت بولنا"۔۔۔ شافع نے کافی غصے سے فولڈ کیا ہوا نیوز پیپر ٹیبل پہ پھینکا اور ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔۔۔ وہ اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے جیسے ہی کاریڈور میں داخل ہوا اریحہ بھاگتے ہوئے آئی اور اس سے ٹکرا گئی، ٹکر بہت زوردار تھی۔۔۔ دونوں کو برابر لگا تھا۔ اریحہ ایک دم پیچھے ہوئی تھی۔
"اندھی ہو کیا۔۔۔ دکھائی نہیں دیتا، ہر دم بچوں کی طرح اودھم مچاتی رہتی ہو، چھوڑ دو یہ بچپنا"۔۔۔ شافع خاصے غصے سے بولا شاید مزنہ کا غصہ اریحہ پہ نکال رہا تھا۔۔۔ جبکہ اریحہ کی جھیل جیسی گہری آنکھیں یکا یک پانیوں سے بھر گئی تھی۔۔۔ شافع نے اسے اتنی زور سے جوڈانٹا تھا۔
"آئی ایم سوری"!۔۔۔۔ اریحہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو ایک دم شافع کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، کسی اور کا غصہ اس پیاری سی لڑکی پہ نکال دیا تھا جو کہ اس وقت بلیک کلر کے بڑے سے گھیر والے پلازو پہ ریڈ لانگ ٹاپ اور بلیک دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔۔۔ ریشمی سیاہ بالوں کی اونچی سی پونی بنی ہوئی تھی، میک اپ سے بے نیاز چہرے کے ساتھ وہ بہت معصوم سی لگ رہی تھی۔۔۔۔۔ اریحہ نے خفگی سے اسے دیکھا اور واپسی کے لیے مڑی لیکن یہ کیا آنکھوں سے ہوتی اشکوں کی برسات کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا اور پاؤں گھیر دار پلازو میں الجھا اور وہ دھپ سے ماربل پہ گر پڑی۔۔۔ شافع جلدی سے اس کے پاس چلا آیا، جبکہ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔۔
"آر یو اوکے"۔۔۔۔؟ شافع گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔
"یس آئی ایم فائن"۔۔۔۔ اریحہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا جو اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے میں لگا ہوا تھا۔۔۔ بلیک جینز پہ گرین کلر کی ٹی شرٹ پہنے اپنے براؤن ون سائیڈ بالوں سمیت وہ اسے بہت ڈیشنگ لگا۔۔۔ اریحہ کو شرمندگی کی وجہ سے اور رونا آرہا تھا، نا جانے کیوں ہر بار شافع کے سامنے ہی اوٹی بونگی حرکتیں ہو جاتی تھی۔۔۔ جبکہ شافع اس کے تیزی سے بہتے اشکوں کو دیکھ کر ایک دم پریشان ہوا تھا۔
"چوٹ تو نہیں لگی۔۔۔؟ یا پھر پین ہو رہا ہے۔۔؟ آؤ اٹھو"۔۔۔ شافع نے فکر مند سا اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھایا جسے وہ نظر انداز کر گئی اور سائیڈ میں رکھے ہوئے گملے کو پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی، ابھی بھی آنسو اس کی لامبی پلکوں میں اٹکے ہوئے تھے۔
"پلیز بتاؤنا یار، تم رو کیوں رہی ہو"۔۔۔۔؟ شافع کو نہ جانے اس کے آنسو کیوں اتنی تکلیف دے رہے تھے۔۔
"آپ نے اتنی زور سے جوڈانٹا ہے مجھے"۔۔۔ اریحہ نے معصومیت سے کہا اور جلدی سے روم میں گھس گئی جبکہ شافع مسکراتے ہوئے اپنے براؤن بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔
وہ موسم سرما کی ایک سرد شام تھی۔۔۔ سرد ہواؤں کا بسیرا چارسو پھیلا ہوا تھا۔۔۔ پرندے خوب شور کر رہے تھے۔۔ شور تو اس وقت "آفندی ولا" کے لان میں بھی بے تحاشہ ہو رہا تھا کیونکہ اریحہ آفندی اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔۔۔ وائٹ ٹراؤزر پہ وائٹ فل آستین کی ٹی شرٹ اور وائٹ اسکارف گلے میں ڈالے اونچی سی پونی پہ وائٹ کیپ لگائے اس نے جونہی زور کا چھکا مارا وہ گیٹ سے اندر داخل ہوتے شافع کو زور سے لگا۔۔۔ ربر کی گیند تھی جو کہ شافع کے ماتھے پہ لگی تھی اس نے ایک غصیلی نظر اس میچ پہ ڈالی پھر اریحہ کو دیکھا جو اپنی آنکھیں میچے کھڑی تھی۔۔۔ پھر ایک دم اس نے اپنی آنکھیں کھولی اور اسے اپنے جانب گھورتے ہوئے پایا تو ڈر کے مارے بیٹ وہیں پھینک کر وہاں سے

بھاگ گئی جبکہ اس کے دوست اسے آوازیں دیتے رہ گئے۔۔۔درد دینے والی حسینہ تو اندر بھاگ گئی تھی لیکن اس اکڑو شخص سے لبوں پہ پیاری سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔۔

شام ڈھل چکی تھی۔رات نے اپنا سیاہ آنچل پھیلا دیا تھا۔سردی بے تحاشہ تھی۔ممی کے کہنے پہ اریحہ،شافع کو کافی کا مگ دینے کے لیے آئی تھی۔۔۔اس کے روم کے دروازے پہ ابھی دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی آواز پہ وہی رک گئی۔۔۔شاید وہ کال پہ کسی سے بات کر رہا تھا۔

"ریئلی آنٹی!۔۔۔اب میں بہت جلد شادی کر رہا ہوں، مجھے اس سے بہت محبت ہو گئی ہے"۔۔۔شافع مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔۔۔۔!وہ کون سی ایسی فیری ہے جس نے میرے پراؤڈی سے بھتیجے کے دل پہ قبضہ کر لیا ہے"۔۔۔اس کی آنٹی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔۔۔فون اسپیکر پہ تھا اس لیے ان کی آواز باہر تک آ رہی تھی، جبکہ شافع اپنی آنٹی کی بات پہ ہنس پڑا تھا اور ادھر شاید اس کی آنٹی کافی حیران ہوئی تھی۔

"ریئلی شافع!۔۔۔۔۔ میں اس فیری سے ملنا چاہوں گی جس نے آپ جیسے اکڑو کو ہنسنا بھی سکھا دیا ہے"۔۔۔

"ضرور ملواؤں گا آپ کو آنٹی جی، بلکہ میرا پرپوزل تو آپ ہی کو لے جانا پڑے گا نا"۔۔۔وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"یس ڈیئر!۔۔۔ بائے دا وے مسٹر شافع کی پرنسس کے بارے میں ہمیں کچھ پتہ تو چلے کہ کون ہے۔۔۔۔۔؟کیسی دکھتی ہے وہ"۔۔۔؟آنٹی اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

"آنٹی!۔۔۔وہ تو بس میرے دل کی شہزادی ہے۔۔۔بالکل گڑیا جیسی لگتی ہے۔۔۔خاصی ماڈرن بھی ہے،سینسیر بھی ہے۔۔۔گولڈن کلر کے بال ہے، براؤن آنکھیں ہے۔۔۔۔آپ کو تو پتہ ہے کہ مجھے بندروں جیسی حرکتیں کرنے والی لڑکیاں کتنی ناپسند ہے"۔۔۔۔شافع نہ جانے اور کیا کیا کہہ رہا تھا جبکہ اریحہ کا وجود تو ایک دم آندھیوں کی زد میں آ گیا تھا تو کیا شافع سکندر مزنہ خان سے محبت کرتا ہے۔۔۔۔بے خیالی میں کافی کا چینی کا مگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور ماربل پہ گر کر چکنا چور ہو گیا تھا اور ساتھ میں اس کا دل بھی کرچی کرچی ہو گیا تھا۔۔۔اس کی آنکھوں میں بسے خواب ایک پل میں ہی تو ٹوٹے تھے۔۔۔۔۔آواز سن کر شافع باہر چلا آیا،اس کے ہاتھ میں ابھی بھی موبائل تھا لیکن کال ڈسکنیکٹ کر چکا تھا۔۔۔

کافی ماربل پھیل گئی تھی۔۔۔وہ نیچے بیٹھ کر اس کی کرچیاں سمیٹنے لگی، کرچیاں سمیٹتے سمیٹتے اس کے ہاتھ لولہان ہو گئے تھے لیکن اس پاگل کو کہاں فکر تھی، آج تو اس کا دل ہی ٹوٹ گیا تھا۔۔۔

"اومائی گاڈ اریحہ!۔۔۔کیا کر رہی ہو تم۔۔۔۔تمہارے ہاتھ زخمی ہو رہے ہیں"۔۔۔۔۔شافع نے دیوانگی کے عالم میں اسے جھنجوڑا جو اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔اریحہ نے چونک کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ زخم تو معمولی ہے بھر جاتے ہیں لیکن دل پہ لگے زخم کبھی نہیں بھرتے"۔۔۔اریحہ نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا اور بھاگتے ہوئے وہاں سے چلی گئی جبکہ شافع کچھ غلط ہو جانے کے خیال سے وہی پریشان سا کھڑا رہ گیا۔۔۔اریحہ اپنے روم میں آ کے بیڈ پہ بیٹھ کے شدت سے رو دی تھی۔۔۔اور روتی کیوں نا،اس کی دنیا ہی تو ختم ہو چکی تھی۔۔۔اریحہ کو شافع سے محبت ہو گئی تھی، وہ نٹ کھٹ سی لڑکی کے دل پہ نہ جانے کب سے اس شہزادوں کی آن بان والے شخص نے قبضہ کر لیا تھا۔وہ دونوں متضاد طبیعت کے مالک تھے۔۔۔اریحہ جتنی شوخ و چنچل تھی شافع اتنا ہی خاموش طبع تھا۔۔لیکن محبت کسی کا مزاج دیکھ کر تھوڑی ہوتی ہے۔اریحہ نے اپنی محبت کو خود سے بھی چھپا کے رکھا ہوا تھا کہ کہیں اس اکڑو شخص کو اس کی خبر نہ ہو جائے۔۔وہ اپنے پاکیزہ جذبوں کی توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔۔

"آپ بھلا مجھ جیسی پاگل لڑکی سے محبت کیوں کریں گے شافع سکندر"۔۔۔۔۔اریحہ نے بے دردی سے اپنے رخسار پہ بہتے آنسوؤں کو رگڑا اور خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی تھی۔

کئی دن یونہی خاموشی سے گزر گئے۔۔"آفندی ولا" میں عجیب سی خاموشی کا راج ہو گیا تھا کیونکہ اس بولتی مینا کی چہچہاہٹیں کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔۔وہ بولتی مینا ایک دم خاموش ہو گئی تھی وہ پہلے کی طرح اب کوئی نئی شرارت نہیں کرتی تھی۔"آفندی ولا" کے ممبر اس بولتی مینا کے خاموش ہو جانے سے بہت پریشان ہو گئے تھے کیونکہ "آفندی ولا" میں ساری رونقیں ہی اس کے دم سے تھی۔شافع کو وہ کئی دنوں سے دکھائی بھی نہیں تھی شاید وہ اس کے سامنے آنا ہی نہیں چاہ رہی تھی جبکہ شافع اسے دیکھے بنا بے چین سا پھر رہا تھا۔

گلابی جاڑوں کی وہ ایک ٹھنڈی سی رات تھی۔ہلکے ہلکے بادلوں میں روشن چاند جگمگا رہا تھا۔ننھے منے ستارے بھی ٹمٹما رہے تھے۔سردی حد سے بڑی ہوئی تھی۔ٹھنڈی ٹھنڈی سیک رو ہوائیں تیزی سے چل رہی تھی۔

اس کہر آلود موسم میں وہ پاگل سی لڑکی" آفندی ولا" کے لان میں جھولے میں بیٹھی ہوئی تھی، شال وجیکٹ سے بے نیاز وہ یک ٹک اس روشن چاند کو تکے جا رہی تھی، کتنے فاصلے پہ تھا نا وہ چاند۔۔۔۔شافع سکندر بھی تو اس روشن چاند کی طرح ہی تھا اس کی دسترس سے بہت دور۔۔۔۔وہ اس کے بخت کا چاند نہیں تھا۔نہ جانے کیوں محبت اور قسمت کی آپس میں نہیں بنتی جن سے محبت ہوتی ہے وہ قسمت میں نہیں ہوتے۔۔۔۔وہ چاند کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے کسی کے آنے کا پتہ بھی نہ چلا، چونکی تو تب جب کسی نے اس کے کندھوں پہ جیکٹ ڈالی تھی اور وہ اس کے بازو میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔

" مجھے پتہ تھا کہ تم بے وقوف ہو، لیکن اس حد تک ہوں گی اب پتہ چلا۔۔۔اتنی زیادہ ٹھنڈ میں خود کی قلفی جمانے کا ارادہ ہے کیا" ۔۔۔۔ شافع نے بہت غور سے اس کی متورم آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

" ہاں میں بے وقوف ہوں بٹ آپ سے مطلب" ۔۔۔۔۔ اریحہ نے خفگی سے اسے دیکھا جو بلیک کلر کی لوور پے ریڈ جیکٹ ریڈ ٹوپی لگائے، اپنی دلکش مسکراہٹ سمیت بہت پیارا لگ رہا تھا۔۔۔جبکہ شافع کو وہ خفا خفا سی گلابی رنگت والی لڑکی اپنے دل کے سب سے قریب محسوس ہوئی۔

" مانتی ہو مطلب خود کو بے وقوف" ۔۔۔۔شافع نے شرارت سے کہا تو اریحہ نے اپنے کندھوں سے جیکٹ ہٹائی اور ہاتھ میں پکڑ کر بنا کچھ کہے چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی شافع نے اس کی نازک سی کلائی پکڑ کر اسے دوبارہ جھولے پہ بٹھا دیا۔

" بیٹھو یہاں، اور یہ جیکٹ پہنو" ۔۔۔۔شافع نے اب کے تھوڑے سخت لہجے میں کہا۔

" نہیں پہننا ہے مجھے" ۔۔۔۔اریحہ بھی ضدی لہجے میں بولی۔

" ڈونٹ وری ڈیئر!۔۔۔۔میں پہنا دیتا ہوں" ۔۔۔۔شافع دھمکی آمیز لہجے میں بولا جبکہ اس کی آنکھوں میں شرارت کے رنگ دیکھ کر اریحہ ایک دم بوکھلا گئی تھی۔

" نو تھینکس!۔۔۔۔میں خود ہی پہن لیتی ہوں۔۔۔" اریحہ نے جلدی سے وہ بلیک کلر کی جیکٹ پہن لی جبکہ شافع نے اپنے سر کی ٹوپی نکال کر اسے پہنا دی۔اریحہ جز بز سی ہو کر رہ گئی۔

" اچھا سنو!۔۔۔۔میری کچھ ہیلپ کر سکتی ہو کیا" ۔۔۔؟ شافع کو وہ جیکٹ اور ٹوپی میں بالکل گڑیا کی طرح لگی۔

" کیسی ہیلپ" ۔۔۔۔اریحہ اپنے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے بولی۔

" یار!۔۔۔۔ایک بولتی مینا تھی۔۔۔وہ بہت نٹ کھٹ شرارتی اور شوخ تھی، پتہ نہیں کدھر چلی گئی ہے۔۔۔۔اب اس کی میٹھی بولیاں اس کی چہچہاہٹیں مجھے سنائی نہیں دے رہی ہے۔۔۔اسے ڈھونڈنے میں میری ہیلپ کرونا" ۔۔۔وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

" آپ تو تنہائی پسند ہیں نا، پھر آپ اس مینا کی چہچہاٹوں کو کیوں مس کر رہے ہیں" ۔۔۔اریحہ نے جیسے اسے جتایا۔

" کیا کرے یار، اب تو ہم اس بولتی مینا کہ بول کے عادی ہو گئے ہیں۔۔۔اس کے بغیر اب دل نہیں لگتا۔۔۔بولو کریں گی نا ہیلپ میری اسے ڈھونڈنے میں" ۔۔۔۔شافع نے شوخ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

" جی نہیں میں آپ کی کوئی ہیلپ نہیں کر رہی ہوں، جایئے جا کر اپنی مزنہ کو بولیے" ۔اریحہ کا کنٹرول کے باوجود لہجہ بھرا گیا تھا۔

" اور یکلی!۔۔۔۔ویسے میری محبت مجھ سے روٹھ گئی ہے، بتاؤ کیا کروں" ۔۔۔شافع اس سے ایسے بولا جیسے وہ ایک دوسرے سے بہت کلوز ہو۔

" جا کر منایئے اپنی محبت کو وہ روٹھ گئی ہے تو" ۔۔۔۔اریحہ رخ موڑ گئی اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی اس وقت۔

" منانے کے لیے ہی تو آیا ہوں یار" ۔۔۔شافع نے کہا۔

" بٹ مزنہ یہاں تھوڑی ہے" ۔اریحہ نے کافی حیرانگی سے اسے دیکھا۔

" تم سے کس نے کہا کہ مزنہ میری محبت ہے" ۔۔۔شافع نے اپنی چمکتی بھوری آنکھوں سمیت مسکراتے ہوئے کہا۔

" اس رات آپ اپنی پھوپھی سے بات کر رہے تھے تبھی میں نے سنی تھی" ۔۔۔۔اریحہ بے بس لہجے میں بولی۔

" رائٹ!۔۔۔۔اس رات میں نے آنٹی کو اپنی محبت کے بارے میں بتایا تھا بٹ میں نے مزنہ کا نام نہیں لیا تھا" ۔۔۔۔ شافع کی بھوری آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

" نام نہیں بتایا تھا وہ تو میں نے گیس کیا، جس طرح کا حلیہ آپ نے بتایا تھا اس پہ تو مزنہ ہی پوری اترتی ہے" ۔۔۔اریحہ کی خفگی بدستور تھی۔

" وہ تو ایک چھوٹی سی شرارت تھی، میں نے آنٹی کو تمھارے ہی بارے میں سب بتایا تھا بٹ پھر تم مجھے اپنے روم کے دروازے کے پاس کھڑی دکھائی دی تھی۔۔تمھارا پنک آنچل مجھے نظر آ گیا تھا، تبھی میں نے مذاق سے تمھارا پورا حلیہ چینج کر دیا تھا۔۔۔۔بٹ مجھے کیا پتہ تھا کہ میری ایک چھوٹی سی شرارت اس شرارتی شہزادی کا دل توڑ دے گی۔۔۔۔

شرارت کا حق تو بس تمھیں ہی ہے، ہم نہیں کر سکتے تھوڑی سی شرارت۔۔۔ اور مجھے کیا پتہ تھا کہ مزنہ ایسی دکھتی ہے، میں نے کب اسے دھیان سے دیکھا ہے"۔۔۔شافع کی آنکھوں میں آج صرف محبت کے رنگ ہی نظر آ رہے تھے۔

"جھوٹ مت بولیے، مجھے نہیں سننا آپ کی فرضی کہانی"۔۔۔ اریحہ اس کی نگاہوں سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"یار! میری اس محبت کی کہانی کو فرضی تو مت بولو۔۔۔سچ میں یار کتنی انوسینٹ ہو تم، خود سے ہی گیس کر لیا کہ میں مزنہ سے محبت کرتا ہوں۔۔۔مزنہ کیا اس جیسی کئی لڑکیاں شافع سکندر کا دل جیتنے میں ناکام رہی لیکن اریحہ آفندی تو بڑے ہی شان سے میرے دل کی مسند پہ آ کر بیٹھ گئی اور میں بے بس سا بس اس کی پرستش کرنے لگا۔۔۔قسم سے یار، میں نے تم کو چاہا ہے۔۔۔۔بس تم کو چاہا ہے۔۔۔۔۔بے حد بے حساب چاہا ہے۔۔۔اور وعدہ رہا اپنی آخری سانسوں تک تمھیں میں یوں ہی چاہوں گا"۔۔۔شافع محبت سے چور لہجے میں اسے یک ٹک دیکھتے ہوئے بولا تو اریحہ ایک دم نروس ہو گئی۔

"تم نے کبھی میری آنکھوں کو نہیں دیکھا، اگر دیکھ لیتی نا تو اس میں تمھیں صرف اپنا ہی عکس نظر آتا۔۔۔میری آنکھوں میں صرف تمھاری محبت کے جگنو چمکتے ہیں"۔۔۔شافع کی آنکھوں میں سچ مچ اس کی چاہت کے جگنو جگمگا رہے تھے۔

"میں نے آپ کی آنکھوں کو دیکھا ہے، بٹ جب آپ لونگ ہال یا ڈرائنگ روم میں صوفے پہ سوئے ہوتے تھے، آپ کی آنکھیں بند رہتی تھی نا پھر میں کیسے آپ کی آنکھوں کے رنگ دیکھ پاتی"۔۔۔اریحہ معصومیت سے اپنی لامبی پلکوں کی جھالر گراتے ہوئے بولی تو شافع کو اپنا قہقہہ روکنا مشکل ہو گیا جبکہ اریحہ بری طرح سے جھینپ گئی۔

"بائے داوے!۔۔۔میں سویا نہیں رہتا تھا سونے کی ایکٹنگ کرتا تھا کیونکہ جب وہ شرارتی شہزادی مجھے اتنے پیار سے دیکھتی تھی تو مجھے اس کا دل توڑنا اچھا نہیں لگتا تھا"۔۔۔شافع ہنستے ہوئے شرارت سے بولا۔

"بہت برے ہیں آپ"۔۔۔اریحہ جھینپی جھینپی سی بولی۔

"ہم تو بہت برے ہیں، بٹ تم بہت اچھی ہو۔۔۔۔پتہ ہے اریحہ میں جو بچپن سے ہی خاموش طبع اور کم گو سا تھا، ممی، پاپا کی ڈیتھ کے بعد تو پھر ایک دم خاموش سا ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔ان کے بغیر مجھے ایسا لگتا تھا کہ اب میری زندگی ختم ہو چکی ہے، لیکن پھر جب میں" آفندی ولا" آیا، اس ٹائم میں کافی ڈسٹرب رہتا تھا۔۔۔لیکن پھر مجھے تمھاری شرارتیں اچھی لگنے لگی اور ساتھ میں تم بھی۔۔۔تمھاری کھلکھلاہٹیں سن کر میں اپنے سارے درد بھولنے لگ جاتا تھا۔۔۔تمھاری شرارتیں دیکھ کر میرے لب مسکرانا سیکھ گئے۔۔۔تمھارے بغیر میری زندگی ویران ہے، کیونکہ تم ہی تو اب زندگی ہو میری۔۔۔۔ میری زندگی میں شامل ہو کر اپنی شوخی شرارتوں سے میری بے رنگ زندگی کو رنگ سے بھر دوں گی۔۔۔؟ بنوں گی میری ہم سفر۔۔۔۔۔؟ شافع اپنی بولتی آنکھوں سمیت بہت اُمید سے اسے دیکھ رہا تھا، اس سے وفاؤں کی تصدیق چاہ رہا تھا۔

"اچھا جی! جب مُجھ سے محبّت ہو گئی تھی تو پھر کیوں آپ مجھے میری شرارتوں پہ ڈانٹتے تھے"۔۔۔۔؟ اریحہ اپنی آنکھوں میں شرارت سمو کر بولی۔۔۔اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں کی چمک واپس لوٹ آئی تھی۔

"پرامس جاناں!۔۔۔اپنی اس بولتی مینا کی ہر شرارت پہ اس کا ساتھ دوں گا۔۔۔اس کے ساتھ کرکٹ بھی کھیلوں گا۔۔۔سائیکلنگ بھی کروں گا۔۔۔۔اور اس کے ساتھ بندر بن کر پیڑ پہ بھی چڑھ جاؤں گا"۔۔۔شافع ہنستے ہوئے شرارتی لہجے میں بولا تو اریحہ بھی ہنس پڑی، بے ریا اور شفاف ہنسی، شافع تو اس کی ہنسی کے جلترنگ میں کھو سا گیا۔

"تھینکس شافع!۔۔۔۔۔۔ میں نے بھی تو بس آپ سے محبت کی ہے۔۔۔بس آپ کو چاہا ہے۔۔۔میری ہر دعاؤں میں مانگے جانے والی پہلی دعا ہو آپ۔۔۔میری زندگی کا ہر لمحہ آپ کے نام ہے۔۔۔زندگی کی اس رہگزر پہ میں قدم سے قدم ملا کر آپ کے ساتھ چلوں گی"۔۔۔۔اریحہ نے ایک نظر اس دلربا سے شخص کو دیکھا اور اس کی بولتی آنکھوں کی تاب نہ لا کر اپنی نگاہیں جھکا لی، جبکہ شافع بہت محبت، چاہت اور عقیدت سے اس کے چہرے پہ بکھرے محبت کے ان رنگوں کو دیکھ رہا تھا جو کہ انمٹ تھے۔ دونوں کے چہروں پہ ایک الوہی سی مسکان تھی۔۔۔بادل کی اوٹ سے چاند نے محبت کے ان پنچھیوں کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اپنے کارواں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

☐☐☐

Rumana Iffat Rahi
D/o Shaikh Bilal
Hirapura, Near Masjid Darussalam,
Achalpur city
Dist: Amravati-444806 (M.S)

ندا احمد

''سچ''

''سچ کی کہانی....
ہے دائرہ جس کا بہت وسیع
ہے جہان میں جو مشہور قول'
وہ ہے سچ بولو' اور سچ سنو کا
یہ ہے سچ کے وہ دو رخ'
جو ہے یکسر برعکس۔
کبھی ایک آسان'
اور دوسرا ہوتا ہے مشکل
کبھی آسان ہوتا ہے سچ کہنا'
کبھی نہیں ہوتا آسان سچ سننا۔
سچ کا انکشاف دیتی ہے تسکین
تو کبھی دہری اذیت میں ڈالتی ہے
اسی لیے تو کہتے ہیں
سچ کڑوا ہوتا ہے۔
تاہم لوگ اس تلخ گھونٹ کو پینا چاہتے ہیں
جانتے ہیں کیوں؟
کیوں کہ....
یہ تلخ' کڑوا ہونے کے باوجود'
ہمیشہ زندہ رہتا ہے
ہر دھڑکن میں سانس لیتی ہے
یہ ختم کرتی ہے جھوٹے گمانوں کو'
فریب کی دنیا سے پرے لے جاتی ہے
کڑوا ہونے پر بھی لوگ اسے تھامے رہتے ہیں
اس لیے کہتے ہیں
سچ ہمیشہ زندہ رہتا ہے''

Miss Nida Ahmad
Ambikapur
Surguja-497001 (Chhattisgarh)
Mob:9752232178

نوری عشرت

نظم۔ایک مناجات

کبھی موقع ملا تو اک بات لکھوں گی
درد کے سارے لمحات لکھوں گی
زندگی کے ادھورے خواب لکھوں گی
اپنوں کی بے رخی کا حساب لکھوں گی
کچھ ان کہی باتوں کا سوال لکھوں گی
شدید غم سے حالت نڈھال لکھوں گی
اپنی ماضی کے ویرانے لکھوں گی
یعنی سارے قصے پرانے لکھوں گی
سمندر کے ریت پہ تیرا نام لکھوں گی
اور دھوکے کے مناظر سرِ عام لکھوں گی
زندگی کا وہ حسین حصہ لکھوں گی
ہر روز کا نیا قصہ لکھوں گی
ہر اس لمحے کو اب یاد لکھوں گی
رب سے یہی فریاد لکھوں گی
میں سب رشتے ناطوں کو
فقط مطلب ہی مطلب لکھوں گی
کبھی موقع ملا تو سب لکھوں گی

Noori Ishrat
At + Post Kalyanpur
PS +Distt. Garhwa- (Jharkhand)
Email - nooriishrat586@gmail.com

ڈاکٹر افسانہ حیات

غزلیں

اندھیرا غموں کا ، مکیں ہو چلا ہے
تباہی کا اپنی ، یقیں ہو چلا ہے

وہ جس کو دعاؤں، میں مانگا خدا سے
کسی اور کا ، ہم نشیں ہو چلا ہے

وہ اک خواب تھا جو ،تری ہم سری کا
وہی آج زیر ، زمیں ہو چلا ہے

خوشی کی کروں، جستجو کس طرح میں
ترا غم مری جاں، نشیں ہو چلا ہے

کسی اور کا اب ،گلہ بے سبب ہے
مرا دل مرا ،نکتہ چیں ہو چلا ہے

جہاں آنسو ٹھہرتے ہیں ، وہیں گرداب ہوتے ہیں
وہیں گوہر نکلتے ہیں ، جہاں گرداب ہوتے ہیں

محبت کا تماشا تو ، یہاں ہر روز ہوتا ہے
جدا لیکن تماشے کے ، کئی اسباب ہوتے ہیں

کسی کا عشق لیلا کو ، بنا دیتا ہے لافانی
وگرنہ شکل وصورت میں ،کہاں سرخاب ہوتے ہیں

سنورنے تک ،بکھرنے میں ،بہت کچھ ٹوٹ جاتا ہے
لہو روتی ہے جب نرگس ، چمن سیراب ہوتے ہیں

سبھی کے سامنے سر کو جھکا دوں ، ہو نہیں سکتا
یہ دل جھکتا ہے جن کے سامنے ،کمیاب ہوتے ہیں

میں ان کا نام لے دوں تو ,بگڑ جائیں گے وہ مجھ سے
یہاں دشمن کئی ایسے ہیں ، جو احباب ہوتے ہیں

Dr. Afsana Hayat
Asistant Prof.
Satyawati College
Ashok Vihar
New Delhi-110052

انتشارِ شعر (بالوں کا جھڑنا)

ڈاکٹر احسان رؤف

انتشار شعر کو جاننے سے پہلے بالوں کی طبعی نشوونما کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ طبعی طور پر ایک انسان کے سر میں تقریباً ایک لاکھ بال ہوتے ہیں۔ بال عام طور پر ہر مہینہ ایک سینٹی میٹر بڑھتے ہیں۔ ہر بال کے بڑھنے میں تین مرحلے (Cycles) ہوتی ہیں۔ پہلا مرحلہ جس میں بال بڑھتے ہیں اس کو Anagen کہتے ہیں، دوسرے مرحلہ کو Catagen اور تیسرے مرحلہ کو Telogen کہتے ہیں۔ Telogen مرحلہ کے مکمل ہونے کے بعد پرانے بال گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ طبعی طور پر سو بال روزانہ گرنا چاہیے۔ لیکن ان بالوں کا گرنا تب تک ظاہر نہیں ہوتا ہے جب تک کہ بال بڑے نہ رکھے جائے۔ جب بالوں کو دھویا جاتا ہے تب بالوں کا گرنا زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

انتشار شعر بالوں کا ایک عام مرض ہے۔ اس مرض میں سر کے بال عمومی رفتار کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے گرتے ہیں جن کا احساس کنگھی کرتے وقت، غسل کے دوران یا سو کر اٹھنے کے بعد تکیوں پر بالوں کی اضافی تعداد میں موجودگی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ طبعی (Normal) طور پر بڑھاپے میں حمل و رضاعت (Pregnancy & Breast feeding) کے دوران بال جھڑتے ہیں اس کے علاوہ کچھ لوگوں میں موروثی طور پر بھی بال زیادہ گرتے ہیں لیکن ان حالات کو انتشار شعر کے ذیل میں شامل نہیں کیا جاتا ہے۔ بعض حالات میں انتشار شعر کی یہ صورت ابرو اور داڑھی کے بالوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

اسباب

1۔ نقص تغذیہ

انتشار شعر کا عام سبب نقص تغذیہ ہوتا ہے جس میں آئرن، پروٹین کی کمی، وٹامن کی کمی خاص طور سے وٹامن بی کامپلکس اور Biotin کی کمی ہوتی ہے۔

2۔ کچھ حالتوں میں بھی انتشار شعر ہوتا ہے۔ مثلاً حمی (بخار) جو کہ بار بار اور لمبے وقت تک رہے، بچہ کی ولادت، اسقاط کے بعد، شدید خون کی کمی کے بعد، تھائرائڈ کی بیماریاں مثلاً ہائپو تھائرائڈ اور ہائپر تھائرائڈ میں بالوں کا جھڑنا بڑھ جاتا ہے۔

3۔ دواؤں کا استعمال

کینسر میں استعمال ہونے والی دوائیں، اینٹی بایوٹیکس، ٹی بی میں استعمال ہونے والی دواؤں سے بھی بال جھڑنے لگ جاتے ہیں۔

4۔ رطوبت کی کثرت

یہ صورت عام طور پر Sebaceous glands کے زیادہ افراز کی وجہ سے عارض ہوتی ہے۔ بالوں میں ایک حد تک خشکی پائی جاتی

ہے،رطوبت کے کثرت کی وجہ سے یہ خشکی معدوم ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے بال زیادہ مقدار میں گرنے لگتے ہیں۔

علامات

اس مرض کی علامات میں مریض کو طبعی حالت کے مقابلہ میں بال زیادہ گرتے ہیں جس کا احساس کنگھی کرتے وقت، غسل کے دوران یا سوکر اٹھنے کے بعد تکیہ پر بالوں کا زیادہ موجود ہونا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سبب کے اعتبار سے بھی علامات موجود ہوتی ہیں جیسے نقص تغذیہ کا مریض عام طور کمزور ہوگا، خون کی کمی کی حالت میں خون کی کمی کی دوسری علامات بھی موجود ہوتی ہیں۔ امراض مزمنہ کی موجودگی میں مزمن امراض کی دوسری علامات بھی پائی جاتی ہیں۔

اصول علاج وعلاج

☆ سبب کا تعین کرکے اس کا ازالہ کریں۔

☆ نقص تغذیہ کی صورت میں

1۔ قرص کشتہ صدف 1 عدد صبح شام، قرص کشتہ فولاد 1 عدد صبح شام، شربت فولاد 2 چمچ صبح شام استعمال کرائیں۔ بایوٹن کی گولی استعمال کرائیں۔

2۔ مقوی غذائیں استعمال کرائیں۔

☆ مقامی طور پر محمرات (خون کا دوران بڑھانے والی دوائیں) کی مالش کی جائے۔ اس کے لیے روغن زراریح، روغن آملہ، روغن بیضہ مرغ کو ایک شیشی میں ملاکر رکھ لیں۔ رات میں بالوں کی جڑوں میں لگائیں۔

☆ بالوں کو خطمی اور برگ حنا سے دھوئیں اور خردل کو سرکہ میں ملا کر لگائیں۔

☆ روغن حب الآس کا مقامی استعمال کریں اس میں گرم اور سرد دونوں طرح کے اجزاء ہوتے ہیں۔ سرد اجزاء بالوں کی جڑوں کو مضبوط بناتے ہیں جبکہ گرم اجزاء مقامی طور پر قوت جاذبہ کو بڑھا کر تغذیہ کو بہتر بناتے ہیں۔

☆ غلبہ یبوست کی صورت میں حمام کی مدد سے جلد کی ترطیب کریں اور ایک مرطب روغنیات مثلاً روغن لبوب سبعہ، روغن بادام، روغن کدو کی مالش کریں۔

☆ پوست درخت انجیر برگ انجیر، سمندر جھاگ سوختہ ہر ایک 7 گرام فرفیون 1 گرام تمام دوائیں سفوف کرکے آب پیاز میں حل کرکے لگائیں۔

☆ پرسیاؤشاں کو تازہ حالت میں کچل کر بالوں کو دھوئیں۔ یہ نسخہ بالوں کی خشکی Dandruff کے لیے بھی بہت مفید ہوتا ہے۔

☆ روغن پیاز کو بالوں کی جڑوں میں لگانا بھی انتشار شعر میں مفید ہے۔

☆ میتھی دانوں کو پانی میں بھگو کر رکھ دیں اور صبح اس کو پیس کر ماسک بنالیں اس ماسک کو بالوں پر وقفے وقفے سے لگانے سے بالوں کی مضبوطی اور نشونما میں اضافہ ہوتا ہے اور بالوں کی خشکی کا بھی خاتمہ ہوتا ہے۔

☆ کلونجی کے بیج بالوں کے فالیکلس کی پرورش کرتے ہیں، بالوں کی بہتر نشونما میں مدد کرتے ہیں اور بالوں کے گرنے میں کمی لاتے ہیں۔

☆ السی کے بیجوں کا استعمال بالوں کے گرنے کو کم کرتا ہے اور بالوں کی نشونما کو فروغ دیتا ہے۔ یہ اومیگا تھری فیٹی ایسڈ، فائبر، پروٹین، میگنیشیم، کیلشیم، فاسفورس وغیرہ کا بہترین ذریعہ ہے جو بالوں کی جڑوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ السی کا استعمال روٹی بنا کر، بھون کر پاؤڈر بنا کر روزمرہ کی زندگی میں کیا جاسکتا ہے۔

☆ بالوں کے گرنے کے عمل کو روکنے یا سست کرنے کے لیے پیاز کا پانی بے حد مفید ہے۔ پیاز کا رس نکال کر بالوں پر لگائیں اور خشک ہونے پر کسی اچھے شیمپو سے دھولیں۔ اس عمل سے بالوں کے گرنے کا عمل سست ہوجائے گا، جڑے مضبوط اور نئے بالوں کی افزائش بھی ہوگی۔

□□□

Dr Ehsan Rauf
Medical officer (Unani)
476/6c Behind Madeh Ganj Police Chowki
Sitapur Road, Lucknow 226020
Mobile 9984185526.

مراسلہ

"خواتین دنیا" برائے جنوری 2024 وصول ہوا۔ جس کے سرورق پر کچھ منوّر و کچھ موہوم پھلجھڑیاں نئے سال کی آمد اور خوشگوار امیدوں کی کرنیں بکھیرتی ہوئی انسانی احساسات اور توقعات کو تحریک و تہیج دیتی ہوئیں جلوہ گر ہیں۔ اس سال کے اس پہلے شمارہ میں کوئی دس اصناف سخن آراستہ اور 20 ذیلی سرخیاں پیراستہ ہیں اور تقریباً اتنے ہی خواتین قلمکاروں نے اپنی نگارشات ترقیم کی ہیں۔

اداریہ میں نئی مشعل کو نئے باب میں روشن و منوّر کیا گیا ہے کہ نئے سال کی نئی اُمنگوں کے تحت خواتین کو اپنے مقصود کی بازیابی کے لیے بھرپور کدوکاوش سے کام لینا چاہیے تاکہ ہمیں اپنے مقاصد میں مقدور بھر کامیابی حاصل ہو۔ "شخصیت" کے ذیل میں محترمہ امّ سلمہ نے "توران میر ہادی' ماہر ادبیاتِ اطفال ایران" پیش کیا ہے۔ مضمون میں خوبی تو ہے پر تمام تر تقریظی۔ اس میں چھ ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں اور ان کے علاوہ کئی پیراگراف میں اس مضمون کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اس ترتیب میں کوئی 9 فارسی کتب سے مدد لی گئی ہے۔ توران میر ہادی چونکہ والدہ کی نسبت سے جرمن نژاد تھیں اس لیے انھوں نے طفلی ادب، نیز تربیتِ اطفال میں نفسیات، جین پیگے (Jean Piaget)، ہنری والن، جان ڈیوی اور ماریا مونٹیسوری (Maria Montessori) وغیرہ کو جگہ دی ہے۔ مضمون نہایت معلوماتی ہے "نکہت سخن" کے ذیل میں شاعرات کا منتخب کلام شامل ہے۔ ان میں اسماء، مقبول، برکھا رانی لکھنوی، پریتا واجپئی، پھول لکھنوی کے کلام بطور خاص پسند آئے۔ "جہانِ نسواں" کوئی سات مقالات سے عبارت ہے۔ سبھی چنندہ ہیں لیکن بطورِ خاص پہلا مقالہ توجہ طلب ہے۔ دراصل مصنف نے 1950 میں لکھے گئے ناول بعنوان "اندھیرا خواب" کی کردار نگاری کا جائزہ لیا ہے لیکن یہ جائزہ بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ یہ ناول جو کہ سگمنڈ فرائڈ کے پیش کردہ تھیوری کے تین دریچوں یعنی بند دریچہ، نیم وا اور کھلا دریچہ۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ ناول بجائے سگمنڈ فرائڈ کے کارل ینگ (Carl Jung) کی تھیوری 'مخفی موادِ خواب' سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے جس میں تمثال کا ایک جہان آباد ہوتا ہے۔ یہ مقالہ اپنی ندرت کی وجہ سے توجہ کھینچ لیتا ہے لیکن اس کے مطالعہ کے دوران شفیق الرحمٰن کا ایک لفظ بار بار ذہن کریدتا ہے یعنی "سگنل فراڈ" اور نہ جانے کتنے ذہنوں کو یہ ورغلاتا ہو۔ لاحول ولاقوۃ۔ ڈاکٹر ناز آفرین نے رفیعہ منظور الامین کی تخلیق "عالم جاہ" کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ابتدا ہی سے انھوں نے ضروری اصطلاحات کی تفہیم کا خیال رکھا اور قومی اردو کونسل نئی دہلی کی شائع شدہ اس کتاب کے تنقیدی جائزہ میں کوئی کسر فروگذاشت نہ کی اور جو وضاحت اسے درکار تھی اس میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اس طرح یہ مقالہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دیگر مقالات بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ ضرور پڑھیے۔ "مسائل نسواں" کے ذیل میں شبینہ بانو سلمہا نے "ہندوستان کے زرعی شعبے میں دیہی خواتین کا اہم کردار" پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فی زمانہ نئے ہندوستان میں (دیہی) خواتین سماجی، اقتصادی اور ماحولیاتی تبدیلیوں کے لیے کوشاں ہیں۔ ان میں سے 80% خواتین زراعت سے وابستہ ہیں اور یہ کہ ہر سال 15 اکتوبر بطور "کسان خواتین کا دن" منایا جائیگا۔ ایسے کتنے ہی زرّیں نکات اس زرخیز مضمون میں شامل ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اخیر میں چند ایک تجاویز بھی درج ہیں۔ پڑھ لیجیے۔ "حسنِ سخن" کے تحت دو عمدہ نثری/آزاد نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر بشریٰ خاتون اور دوسری بیگم آبگینہ عارف نے سپردِ قلم کی ہیں۔ دونوں نظموں کے کیا کہنے! "افسانہ" میں تین افسانے دیئے گئے ہیں۔ تینوں اسی طرح قابل تعریف ہیں جن مدارج پر انھیں ترتیب دیا گیا ہے پہلا افسانہ بعنوان "اور جب نمودِ سحر مسکرا اُٹھی" محترمہ خیرالنساء علیم کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ کہانی وہی ہے پر اسے سلیقے سے لکھا گیا ہے کہ ناقابل اعتبار واقعات و حادثات پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کی قرأت کے بعد غالب کا یہ مصرعہ ذہن زد ہو گیا ع شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔

دیگر افسانے بھی اچھے ہی ہیں۔ پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ "صحت" میں ڈاکٹر اشرف آثاری نے "احساس محرومی اور خواتین" پیش کیا ہے۔ خواتین کے بارے میں یہ ایک نفسیاتی تحریر ہے جسے پڑھنے کے بعد جو خواتین محرومی کے شدید احساسات سے دوچار ہیں۔ انھیں یک گونہ اطمینان اور آسودگی کا احساس ہوگا۔ اس پُر بہار شمارہ میں نظریوں کھوگئی جیسے کوئی فردوس میں مصروفِ گلگشت ہو۔ اصغر گونڈوی۔

تُم سامنے کیا آئے اک طُرفہ بہار آئی
آنکھوں نے مری گویا فردوسِ نظر دیکھا

مخلص

مصطفی ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-۱۱، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا) 431001

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمایوں نامہ

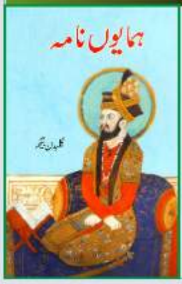

مصنف: گلبدن بیگم

چھٹی اشاعت: 2021

صفحات: 92

قیمت 55 روپے

دامان مریم

مصنف: محمد حسن، تحقیق و ترتیب: جمیل اختر

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 192

قیمت: 160 روپے

اردو-ہندی لغت

ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ

کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 416، قیمت: 125 روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

کلیات امور طبیعیہ

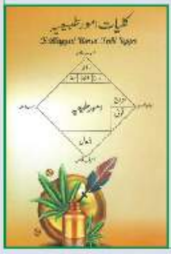

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

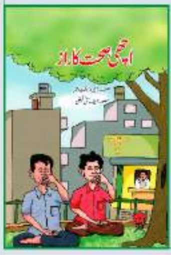

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, मार्च – २०२४ वर्ष: ८, अंक: ३

Mahnama Khawateen Duniya Monthly March 2024 ,Vol. 8, Issue: 3

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-03-2024
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025